کی پوری قوت سے مخالفت کی ہے ان کے نزدیک یہ نہ توحسن مذاق ہے اور نہ حق پسندی کہ گلاب کا پھول کسی میخانہ کے صحن میں اس کے زیر سایہ کھلے تو وہ گلاب ہے، اور اس سے لطف اٹھایا جائے اور اگر کسی مسجد کے چمن میں کھل جائے تو پھر اس میں کوئی حسن نہیں، مولانا نے دونوں خطبوں میں ادب کی تعریف اور اس کا مقصد بھی بلند آہنگی اور جوش بیان کے ساتھ بتایا ہے، اس روداد میں دو عرب فضلاء کے مضامین کا اردو ترجمہ بھی درج ہے، ان میں اسلام کے ادبی و تنقیدی نظریے، اسلامی ادب کی خصوصیات اور اس کے اہم اجزاء و عناصر کا ذکر ہے، شروع میں لائق مرتب نے اجلاس کے سلسلہ کی ضروری اور قابل ذکر باتیں تحریر کی ہیں، اور اہم شرکاء کا ذکر بھی کیا ہے، اس روداد کی اشاعت اس حیثیت سے بھی مفید ہے کہ اس سے ادب کی اہمیت، اسلامی ادب کی قدر و قیمت اور اس کی خصوصیات وغیرہ معلوم ہوتی ہیں۔

اب جن کے دیکھنے کو ...... از جناب انیس قدوائی صاحبہ، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۰۰، مجلد قیمت ۱۲ بارہ روپیے ۵۰ پچاس پیسے، پتہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

اس کتاب میں مختلف طبقوں کے بعض نامور اشخاص کا قلمی خاکہ درج ہے، ارباب سیاست میں مولانا محمد علی، پنڈت جواہر لال نہرو، رفیع احمد قدوائی اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی سیرت و شخصیت کی مصوری کی ہے، سماجی و قومی سرگرمیوں میں حصہ لینے والی خواتین میں مردولا سارابھائی اور قدسیہ زیدی کی شرافت، ہمدردی اور خلوص و دلنوازی کا ذکر ہے، بلند علمی و ادبی ذوق رکھنے والے تعلقہ داروں میں اپنے والد محترم ولایت علی بمپوق، اور چودھری محمد علی کی باغ و بہار شخصیت کے جلوے دکھائے ہیں، ماہرین تعلیم اور ارباب علم و قلم میں شفیق الرحمٰن قدوائی اور ڈاکٹر سید عابد حسین کے متعلق تاثرات قلمبند کئے ہیں اپنے ایک خاندانی ملازم حافظ جمن کا ذکر خیر بھی شوخی و ظرافت کے پیرایہ میں کیا ہے، تاثرات و مشاہدات پر مشتمل اس مجموعہ کے ۱۳ تیرہ مضامین میں جن اشخاص کا ذکر ہے، ان کی زندگی کے نمایاں خط و خال، اہم خصوصیات و عادات، دلچسپ حالات و واقعات اور عام سرگرمیوں اور دلچسپیوں کی تصویر سامنے آجاتی ہے، مصنفہ کو شوخی و ظرافت اور رعنائی تحریر اپنے والد بزرگوار سے وراثۃً ملی ہے، اسلئے اس کتاب کو پڑھ کر لوگ محظوظ بھی ہونگے اور اس سے ان کی واقفیت میں اضافہ بھی ہوگا۔

"ض"

جلد ۱۳۱ ماہ ربیع الثانی ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۸۳ء عدد ۲

مضامین

مقالات

آثار علمیہ و ادبیہ

شذرات

کچھ عرصہ سے اس برصغیر کی اردو شاعری کے آسمان پر سیاہ بادل برابر چھائے ہوئے ہیں، فراق گورکھپوری اور جوش ملیح آبادی کے بعد احسان دانش، حفیظ جالندھری اور اب نشور واحدی اللہ کو پیارے ہوئے۔

ان کی رحلت سے اردو شعر و ادب کے قصر کی زرنگارنگی میں بڑی کمی پیدا ہوگئی ہے، احسان دانش نے اپنی زندگی ایک پریشان حال مزدور کی حیثیت سے شروع کی، لیکن اپنی وفات سے پہلے اردو شاعری کے ایک تاجدار تسلیم کرلیے گئے تھے، ۱۹۴۷ء سے پہلے وہ اعظم گڈھ کے مشاعروں میں برابر آتے رہے، اس وقت تک ان کے کلام کے مجموعوں میں نفیرِ فطرت، جادۂ نو، چراغاں، دردِ زندگی، نوائے کارگر، آتش خاموش، حدیثِ ادب اور گورستان وغیرہ چھپ چکے تھے، مشاعرہ کے اسٹیج پر آتے تو ان کے چہرہ سے ان کی زندگی کی سادگی اور پریشانی ظاہر ہوتی، مگر کلام سناتے تو ان کے خیالات کی پرکاری اور رعنائی سے سامعین متاثر ہوکر محسوس کرتے کہ وہ اپنی شاعری میں جادۂ نو پر چل رہے ہیں، غزلیں سناتے تو تغزل کا چراغاں کرکے دردِ زندگی کے رازِ پنہاں کو عیاں کرتے، ان کی زندگی زیادہ تر پریشانیوں میں گذری، مگر وہ آتش خاموش بن کر ایک شاعر کا حق ادا کرتے رہے، اسی لیے ان کی سخنوری نوائے کارگر اور حدیثِ ادب بنی رہی، ان کی مشقِ سخن کی کہانی ان ہی کی زبانی یہ ہے کہ جب ان پر جذبۂ شاعری طاری ہوتا تو وہ اپنی روح میں التہاب پاتے، اور جب شعر سپردِ قلم کردیتے تو محسوس کرتے کہ الفاظ میں، کاغذ پہ، دائروں، نقطوں، مرکزوں اور پیوندوں کے نیچے ان کی روح دبتی چلی جارہی ہے، اور جب کوئی نظم پایۂ تکمیل کو پہونچ جاتی تو اپنی روح کو سبک، اور آرام طلب پاتے، پھر وہ میٹھی نیند سو جاتے۔

وہ اردو کے نظم گویوں کی صفِ اول میں آگئے تھے، تصویرِ خیالی ہو، نیرنگِ تصور ہو، حسن نظر ہو،

اثراتِ رباب ہو، متھرا کی چاندنی رات ہو، سب میں ان کی نظم گوئی کی جلوہ طرازیاں ہیں، وہ مزدوروں کے شاعر کی حیثیت سے بھی مشہور ہوئے، فاقہ کشی کے الم پرور مناظر، سرمایہ داری کے خونچکاں مرقعے اور پامال انسانیت کے درد انگیز خاکے بڑے موثر انداز میں پیش کرتے رہے، یہ محض جگ بیتی نہیں تھی بلکہ آپ بیتی بھی تھی، مگر وہ کسی لمحہ بھی اشتراکی نہیں ہوئے، راسخ العقیدہ مسلمان رہ کر اپنے مالک حقیقی سے جاملے، ان کی یہی راسخ العقیدگی آخرت میں زادِ راہ ہوگی، اللہ تبارک و تعالیٰ ان کی فطرتِ سلیم کے بدلے ان کو کوثر و تسنیم سے سیراب کرے، آمین۔

ابوالاثر حفیظ جالندھری اردو شاعری کے مرصع کار ستون بنے رہے، اپنے آغازِ شباب میں مناجات تہجد لکھی تو خواجہ حسن نظامی نے اس کو شایع کرکے لکھا کہ اگر میں دولت مند ہوتا تو اس مناجات کے ہر شعر کے معاوضہ میں ایک اشرفی نذر کرتا، کچھ دنوں وہ مزدوروں اور کسانوں کی دلسوزی کا بھی راگ الاپتے رہے، ہندو مسلمانوں کو پریت کا گیت بھی سنایا، "ہندوستان ہمارا" میں تاریخِ ہند کو نظم کرکے بچوں کے دلوں میں مطالعہ تاریخ کا ذوق پیدا کرنے کی بھی کوشش کی، مناظرِ فطرت کی مصوری بھی کی، جوانی کے جذبات کی ہنگامہ آرائی میں وہ نظم لکھی جس کا عنوان ہے "ابھی تو میں جوان ہوں"، اور یہ اب بھی بہت مقبول ہے، رومانی گیت لکھنے میں بھی مہارت رکھتے تھے، یکایک ان کا ذوق بدلا تو اس ملّی شاعری کی طرف چل پڑے جس کی جوت ظفر علی خان اور اقبال نے جگائی تھی۔

راقم کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ۱۹۳۴ء میں ان کا کلام ان کی زبانی سننے کا اتفاق ہوا تھا، وہاں طلبہ کی یونین میں مدعو تھے، جو ان کی آمد پر اوپر سے نیچے تک بھر گیا تھا، وہ اس وقت تک شاہنامۂ اسلام کے شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے، طلبہ ان سے اردو شاعری کے فردوسی کی حیثیت سے مل رہے تھے، انھوں نے شاہنامۂ اسلام ہی کا کچھ ٹکڑا اپنے خاص ترنم میں سنایا، تو ایسا محسوس ہوا کہ وہ واقعی ابوالاثر ہیں، شاہنامہ کی پہلی جلد ہی شایع ہو سکی، جس میں جنگ بدر تک کے حالات ہیں، اس زمانہ میں اعلان ہوا تھا کہ اس کی دوسری جلد میں نبوی غزوات کی تفصیل ہوگی، پھر تیسری جلد میں خلفائے راشدینؓ اور اسلامی فتوحات کی باری آئے گی، اردو شاعری کے اس فردوسی کو ایک محمود کی سرپرستی حاصل نہ ہو سکی، اس لیے یہ ایمان پرور کام پایۂ تکمیل کو نہ پہونچ سکا، جو خود مسلمانوں کی حرماں نصیبی ہے۔

شذرات

وہ اپنے پیچھے اپنے کلام کے مجموعوں میں نغمہ زار، سوز و ساز، تلخابۂ شیریں اور چراغِ سحر چھوڑ گئے ہیں، بچوں کے لیے جو نظمیں لکھیں، ان کے بھی کئی مجموعے ہیں، ان کی ایک پرکیف نظم "سلام" بھی ہے جس کو سن کر ایمانی حرارت پیدا ہوتی ہے، پاکستان کا قومی ترانہ بھی ان ہی سے لکھوایا گیا، مگر ان کی اصلی قدر و منزلت شاہنامۂ اسلام ہی کی وجہ رہی اور رہیگی، اور عالم بقا میں وہ شاید اسی صف میں دکھائی دیں جہاں نبی آخر الزماںؐ کے فدائی اور شیدائی ہونگے آمین

ہندوستان میں فراق گورکھپوری کا ماتم ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ نشور واحدی بھی داغِ مفارقت دے گئے، ان کا کلام ان کی دلکش اور مترنم آواز میں اعظم گڈھ کے مشاعروں اور دار المصنفین کی نجی مجلسوں میں ان سے برابر سننے میں آیا، متین سنجیدہ اور پرانی تہذیب کے حامل تھے، ملیا وطن تھا، مگر زندگی حلیم کالج کانپور میں ایک استاد کی حیثیت سے گذاری، شروع میں تعلیم دائرہ رفیع الزمان الہ آباد کے بزرگ شاہ شفاء اللہ سے پائی جن سے فلسفۂ اسلام، فلسفۂ خودی اور مولانا روم کے افکار کے بہت سے رموز و نکات کو اچھی طرح سمجھا ان کا خوشگوار اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا، ان کے کلام کے کئی مجموعے آتش و نم، شور نشور، صہبائے ہند اور فروغِ جام کے نام سے شایع ہوئے، اصغر، حسرت، فانی، جگر اور فراق گورکھپوری کی صف کے بعد جو شعراء کھڑے نظر آئے، ان میں نشور واحدی اپنے شاعرانہ کمال کی گل پیرہنی، مشاطگی اور شیریں بیانی، پھر فکر و فن کے رنگ و آہنگ کی جلوہ گری میں کسی سے کم نہیں نظر آئے، بلکہ بعض حیثیتوں سے اپنے معاصروں میں قد آور دکھائی دیئے

۱۹۴۰ء میں جناب شاہ معین الدین احمد ندوی (سابق ناظم دار المصنفین) نے ان کے مجموعۂ کلام صہبائے ہند کے شروع میں ایک مختصر تبصرہ میں لکھا تھا کہ ان کی شاعری میں تغزل کی رنگینیاں بھی ہیں، قوم و وطن کیلئے پیامِ زندگی بھی، مذہب و ملت کا درس بھی، الفاظ کی سلاست بھی، بیان کی لطافت بھی، معتدل شوخی بھی اور جوش و سرمستی کے نمونے بھی ہیں، اپنی ان شاعرانہ خوبیوں کو انھوں نے آخر وقت تک قائم رکھا، نثر میں ان کی ایک کتاب اسلام میں فلسفۂ خودی پر بھی ہے، دعا ہے کہ ان کا اسلامی جذبہ بارگاہ ایزدی میں مقبول و مبرور ہو، آمین

مقالات

قرآن اور مستشرقین

از

جناب سید اطہر حسین ریٹائرڈ آئی۔ اے۔ ایس، لکھنؤ،

قرآن اپنے آپ کو الفرقان یعنی حق و باطل میں امتیاز کرنے والا کہتا ہے، اس کا پورا مضمون گویا ان الفاظ میں جمع ہوگیا ہے۔

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ — حق آگیا اور باطل نابود ہوگیا، تحقیق

اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا — کہ باطل اسی لیے تھا کہ نابود ہو کر رہے

(۱۷-۸۱)

قرآن کی غرض و غایت حقیقت الٰہیہ کو پیش کرنا ہے، قرآن درحقیقت مجسم سچائی اور قانون ہے، وہ تذبذب اور شک و شبہ یا بالفاظ دیگر باطل اور گناہ کو نیست و نابود کرتا ہے، باطل سے مراد یہ عقیدہ رکھنا کہ ذات مطلق کا وجود ہی نہیں ہے، یا یہ کہ اس کی ایک اضافی حیثیت ہے، یا یہ کہ ذات مطلق ایک سے زیادہ ہو سکتے ہیں، یا یہ کہ خود اضافی ہستی ہی ذات مطلق ہے، اسلام کی بنیاد ذات مطلق سے تعلق رکھتی ہے، قرآن کی رو سے اس کی ذات کا یقین فطرت انسانی میں ودیعت کر دیا گیا ہے، انسان کی تخلیق پر اسے ذات مطلق کی جھلک ملی تھی اور اسے مقصد کائنات اور اشیاء کے اسماء و مفہوم سے واقفیت کرادی گئی تھی، یہ امر

اس کی فطرت کے خلاف ہوگا کہ وہ کائنات کے قوانین اور اشیا پر غور کرے، اور خالق
کائنات سے انکار کردے، کائنات میں جو منصوبہ، توازن اور ہم آہنگی کی کارفرمائی ہے، وہ
خود بزبان حال پکار پکار کر کہتی ہے کہ ان کا خالق عظیم ترین وجود ہے، جو کائنات کا مالک ہے،
اور جسے اقتدار اعلیٰ حاصل ہے۔

دوسرے الہامی مذاہب کے برخلاف اسلام کا سب سے بڑا اور بنیادی عقیدہ ہے،
کہ کوئی الوہیت یا حقیقت الٰہی یا ذات مطلق توحید باری تعالےٰ یعنی حقیقت الحقائق یا
ذات مطلق کے سوا نہیں ہے، اور تمام انبیاء علیہم السلام انسانیت کو یہی پیغام پہنچانے کے لیے
مبعوث ہوئے تھے، قرآن صرف توحید باری تعالیٰ پر زور دیتا ہے، بلکہ اس پر بھی یقین لازمی
ہے، کہ اپنی اصلی شکل میں تمام انبیاء علیہم السلام کا یہی عقیدہ اور پیغام تھا، قرآن کسی ایک
فرقہ، یا قوم یا گروہ کے لیے نہیں ہے، بلکہ پوری انسانیت کے لیے پیغام خداوندی ہے، تمام
الہامی مذاہب کی ایک ہی بنیاد تھی، اور صرف شریعت اور قوانین و دستور میں جزوی
فرق اس وقت کے معاشرہ اور ذہن انسانی کے عروج کے اعتبار سے تھا، لیکن جیسے جیسے زمانہ
گذرتا گیا، دوسرے مذاہب کے پیرووں نے تحریف و تخریب سے کام لیکر ان کی شکل بگاڑ دی
پیغامات کو اصلی رنگ و روپ میں پیش کرنے کے لیے اور لوگوں کو ان کے انحراف اور تحریف
پر آگاہ کرنے کے لیے اور حقیقی اور ازلی صراط مستقیم پر لانے کے لیے یہ آخری پیغام خداوندی خاتم الانبیاء
سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نازل ہوا، یہ وحی اس وقت نازل ہوئی، جب عقل
و دانش کے دور کا آغاز ہو چکا تھا، اور انسان غور و فکر اور تدبر سے کام لینے لگا تھا، اور حقائق کی
قدر و قیمت پہچان سکتا تھا، اور انسان کی مادی ترقیوں نے وہ ذرائع فراہم کردئے کہ پیغام خداوندی
عالم کے کونے کونے تک پہنچ سکتا تھا، قرآن کہتا ہے کہ اسلام انسان کا فطری مذہب ہے اور

اس فطرت کے مطابق ہے، جس پر انسان کی تخلیق ہوئی، اور خداوند کریم کے دستور اور طور
طریقہ میں کبھی کوئی فرق نہیں ہوتا ہے، اور اسلام ہی صحیح مذہب ہے،

صرف اس وجہ سے کہ اسلام عقیدہ تثلیث کا حامی نہیں ہے عیسائی مشنری اور یہودی پیشواؤں نے اور ان کے
زیر اثر مستشرقین نے اسلام پر بے بنیاد الزامات تراشے اور اس کی مذمت کی، اپنے عقیدوں اور اصولوں
کی بقا اور برتری ثابت کرنے کے لیے ان مستشرقین نے اس بات پر سب سے زیادہ زور
دیا، کہ قرآن کتاب الٰہی نہیں ہے، بلکہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تخلیق ہے، اور جو
اس میں انبیاء علیہم السلام کے واقعات و قصص ہیں، وہ عیسائیوں اور یہودیوں کی کتابوں
سے لیے گئے ہیں، اور یہ کہ قرآن کی آیتوں میں تکرار ہے، اور کہیں ناقابل فہم ہیں اور قرآن کی
موجودہ سورتوں اور آیتوں کی ترتیب میں کوئی منطق نہیں ہے،

ان تمام اعتراضات اور مفروضات کا ماخذ عیسائیوں کی مشنری کاوش ہے،
جس کا نصب العین اسلام کے چہرے کو داغدار دکھانا تھا، اس کی تبلیغ و اشاعت میں
رکاوٹ پیدا کرنا تھا، اور اپنے مذہب کی فوقیت ظاہر کرنا تھا، یہ اعتراضات اور مفروضات
قرآن کے بنیادی اصول اور عقائد سے لاعلمی پر یا قرآن کے طرز بیان سے ناواقفیت پر یا
ان غلط تراجم پر مبنی ہیں، جو مستشرقین کے ہاتھوں انجام پائے تھے، جنھوں نے نادانستہ یا دانستہ
طور پر قرآن کی بہت سی آیتوں کے معنی و مفہوم کو بدل کر یا مسخ کرکے پیش کیے اور علمی
تحقیق اور صحیح جائزے کے منافی ہیں، شروع میں یہ اعتراضات اور ریشہ دوانیاں
بھونڈے طریقہ یا بدزبانی کے ساتھ اٹھائے گئے، لیکن جیسے جیسے وقت گذرتا گیا اور تحقیقی
کاموں میں کچھ صداقت آنے لگی اور اسلام کے تہذیب و تمدن اور اس کے اثاثہ کی گہرائی
وسعت اور حقیقت کا زیادہ انکشاف ہوتا گیا، تو انھوں نے تنقید کا طریقہ بدل دیا، اور

اپنی ستایش آمیز حکمت عملی کے ساتھ تیر ونشتر لگانے لگے،

جارج سیل نے جنھوں نے انگریزی زبان میں سب سے پہلی بار قرآن کا ترجمہ ۱۷۳۴ء میں کیا، اپنے ترجمہ کے دیباچہ میں لکھا ہے، کہ اس سے قبل جو لاطینی زبان میں ترجمے تھے، ان میں اصل سے انحراف تھا، ببلینڈر (Bibliander) نے جو ۱۵۴۳ء میں لاطینی زبان میں ترجمہ کیا، اس کو ترجمہ ہی نہیں کہا جا سکتا ہے، کیونکہ اس میں اتنی کثیر غلطیاں ہیں، اور اتنی جسارت سے کام لیا گیا ہے، اور اتنی چیزوں کا اخفا کیا گیا ہے، یا تبدیلی کی گئی ہے کہ اس کی اصل سے کوئی مطابقت یا مماثلت نہیں ہے، ایک اور مستشرق کے لاطینی ترجمہ کے متعلق جارج سیل نے لکھا ہے کہ وہ اور بھی ناقص ہے، اور جو ترجمہ (Ardrea Arrivadbere) نے فرانسیسی زبان میں کیا ہے، وہ کسی طرح ترجمہ کہلانے کے لائق نہیں ہے، کیونکہ اس کے ہر صفحہ پر بے شمار غلطیاں ہیں، جا بجا تحریف یا اضافے ہیں، اور آیتوں کو مسخ کیا گیا ہے، جو ناقابل معافی ہے، اسی فرانسیسی ترجمہ کو الکزنڈر روز (Alexander Ross) نے انگریزی زبان میں کیا، جس کے متعلق جارج سیل کی رائے ہے، کہ (Alexander Ross) عربی زبان متعلق نہیں جانتے تھے، اور نہ انھیں فرانسیسی زبان پر عبور تھا، اور انھوں نے (DuRyer) کی غلطیوں میں اپنی طرف سے اضافہ کیا، اور انھوں نے بہت ہی مذموم زبان استعمال کرکے ترجمہ کو مضحکہ خیز کر دیا۔ Father Lewis Marracci نے ایک لاطینی زبان میں ۱۶۹۵ء میں ترجمہ کیا تھا، جس کے متعلق سیل نے یہ اظہار خیال کیا ہے، ان کی تفسیر اور ترجمہ میں تمام تر تکرار ہے، جس کی وجہ سے ضخامت تو بڑھ گئی مگر اتنا ہی غیر اطمینان بخش ہے، اور کہیں کہیں زبان میں جسارت اور گستاخی سے کام

لیا گیا ہے،

خود اپنے ترجمہ کے متعلق سیل کا کہنا ہے کہ ان کا مقصد اس غلط فہمی کو دور کرنا ہے، جو لوگوں میں بہتر ترجموں سے پیدا ہو گئی ہے، اور Protestants ہی کامیابی کے ساتھ قرآن پر حملہ کر سکتے ہیں اور بھروسہ ہے کہ قدرت نے Protestant کا ہی انتخاب کیا ہے کہ وہ قرآن کو شکست فاش دیں، انھوں نے اون کے پیش رو مترجمین اور مستشرقین کی مذمت کی، جنھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی یا قرآن عظیم پر بے بنیاد الزامات تراشے اور نہایت ہی قابل اعتراض زبان استعمال کی، مگر اپنی بے لوث کوشش اور فراخ دلی کے متعلق فرماتے ہیں، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نعوذ باللہ کتنے ہی بڑے مجرم کیوں نہ رہے ہوں، کہ انھوں نے انسانیت پر ایک غلط مذہب تھوپا، مگر ان کی ذاتی صفات سے انکار نہیں ہو سکتا ہے، اور میں لائق اور متقی Spanhemius کو داد و تحسین دیتا ہوں کہ ہر چند وہ سمجھتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (نعوذ باللہ) ایک حیل ساز تھے، مگر انھیں بھی تسلیم ہے کہ قدرت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام کمالات سے متصف کیا تھا، جس میں جسمانی خوبصورتی، لطیف زیرکی، اخلاق حمیدہ، غربا پروری، تواضع حریفوں اور غنیموں کے مقابلہ میں استقلال و ثابت قدمی، خدا کی حمد و ستایش کرنے والے مکاروں، زناکاروں، قاتلوں، حریصوں، افترا پردازوں کے خلاف سختی شامل تھی، اور ہمت و استقلال، سخاوت، ترحم، شکر، والدین اور بزرگوں کی عزت کے بڑے داعی و مبلغ تھے، اور ہمہ وقت حمد باری تعالیٰ میں لگے رہتے تھے،

جارج سیل نے خود حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی توصیف ان الفاظ میں کی ہے، آپ کی ہوش مندی، عاقلانہ و کریمانہ برتاؤ اور رویہ جس کے تحت اپنے مشن میں

مصروف رہے، اسی جاہلانہ اعتراض کی تردید کرتے ہیں، کہ آپ ایک سخت خود مذہبی پیشوا تھے، سورۂ فاتحہ کے متعلق وہ کہتا ہے، کہ اگر یہ مان لیا جائے، کہ آپ کے جذبات و خیالات کی صحیح ترجمانی کرتی ہے، تو وہ دیدہ و دانستہ جعل سازی سے کام نہیں کرتے تھے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سورۂ فاتحہ نماز کی ہر رکعت میں بڑے خضوع و خشوع سے پڑھتے تھے لیکن جارج سیل نے اس میں شک ظاہر کرنے سے گریز نہیں کیا۔

Rd. E. M. Wherry نے سیل کے ترجمہ کو اپنی تفسیر کے ساتھ چار جلدوں میں شائع کرایا، اور خود دیباچہ میں انکشاف کرتے ہیں کہ یہ تفسیر اپنے جیسے لوگوں کے لیے ہے، جو مسلمانوں میں عیسائیت کی تبلیغ میں لگے ہوئے ہیں، انھوں نے اپنے فاسد خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ نعوذ باللہ قرآن خود ثبوت فراہم کرتا ہے، کہ وہ جعلسازی کی پیداوار ہے، اور پیغمبر اسلام کا یہ جھوٹا دعویٰ ہے کہ قرآن سابقہ کتب الٰہی کی تصدیق کرتا ہے، اس نے اپنا مقصد ان الفاظ میں واضح کیا کہ منازعہ اور نزاع کی تمام تنقیحات کو اس وجہ سے واضح کیا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کو اس عظیم ہستی حضرت عیسیٰ کا صحیح علم ہو جائے جنکے متعلق تمام انبیاء علیہم السلام نے پیشین گوئی کی کہ وہ خداوند قدوس کے فرزند تھے، اور گنہ گاروں کے نجات دہندہ،

ان تمام تراشیدہ الزامات اعتراضات، بہتان، اور مفروضات پر بحث کرنے اور ان کو تمام تر غلط ثابت کرنے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ وہ تمام باتیں سامنے لائی جائیں جو بین اور ناقابل تردید ثبوت پیش کرتی ہیں کہ قرآن عظیم کسی انسان کی تخلیق ہو ہی نہیں سکتی اور خالق کائنات کے سوا اس کا کوئی خالق نہیں ہو سکتا ہے، اللہ تعالیٰ قرآن میں خود فرماتا ہے۔

"اس کتاب کو ہم نے آپ (محمدؐ) پر اس لیے نازل کیا ہے، کہ آپ بنی نوع انسان کو

ان کے رب کے حکم سے تاریکیوں سے نکال کر خدائے غالب و ستودہ صفات کے نورانی راستے کی طرف لے جائیں۔" (ابراہیم)

"اور جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے وہ جانتے ہیں کہ جو (قرآن) آپ پر نازل کیا گیا ہے، وہ حق ہے، اور اس خدا کا راستہ بتاتا ہے جو غالب اور محمود ہے۔" (سبا ۶-)

یہ ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شبہ نہیں ہے، پرہیزگاروں کے لیے (سرچشمہ) ہدایت ہے۔

قرآن خود اس بات کی شہادت دیتا ہے، کہ وہ اللہ کا کلام ہے، قرآن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی تو براہ راست مخاطب کرتا ہے، اور کبھی بصیغۂ غائب، اس کا انداز بیان حدیث سے مختلف ہے، اگر احیاناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی لغزش ہو جاتی، یا کسی معاملہ میں آپ کو پس و پیش ہو، تو وحی الٰہی سے آپ کی رہنمائی ہو جاتی تھی، اور کبھی کبھی آپ کو اس کا انتظار کرنا پڑتا تھا،

جو لوگ قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں شک و شبہ کرتے ہیں، انھیں قرآن پہلے تو یہ چیلنج دیتا ہے، کہ اس کے مماثل کوئی کتاب پیش کریں، اگر ایسا نہیں کر سکتے، تو یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اس کے ان سورتوں کے مماثل سورتیں بنا لائیں اس کے بعد چیلنج دیتا ہے، کہ کم از کم ایک سورہ کے مانند یا اس سے ملتی جلتی ہی کوئی سورہ بنا کر پیش کریں، واضح رہے کہ یہ چیلنج صرف زمانۂ نزولِ قرآن کی حد تک محدود نہیں تھا، بلکہ ہر زمانہ اور ہر وقت کے لیے کھلا ہے، قرآن نہ صرف اپنے مضامین کی بلند پائیگی اور اپنے پیام کے اعتبار سے بے نظیر اور ناقابل نقل ہے، بلکہ اپنے باوقار اسلوب بیان، تشبیہ و استعارات کے تنوع اور الفاظ میں عکاسی کے لحاظ سے بھی بے مثل ہے، اسکی اہمیت اور اس کا طرز بیان انسانی طاقت سے باہر اور ناقابل تمثیل ہے، قرآن کی

ادبیت کا کچھ اندازہ جامع الازہر کی حسب ذیل تحریر سے ہوتا ہے۔

(۱) قرآن کا انداز بیان نہ کسی مہذب شہری کی بزم نگاری و نزاکت کے مانند ہے اور نہ ایک خانہ بدوش بدوی کی درشت کلامی کے مماثل ہے، بلکہ وہ اول الذکر کی شیریں کلامی اور ثانی الذکر کے زور کلام کا حسین مجموعہ ہے۔

(۲) نثر میں الفاظ کا وزن اور نغمہ اس طرح برقرار رکھا گیا ہے، جیسا کہ منظوم کلام میں ہوتا ہے، وقفے نہ بالکل نثر کی شکل میں آتے ہیں، نہ نظم کی صورت میں بلکہ عبارت میں موزونیت اور نغمہ کا ایک نرالا تناسب پایا جاتا ہے۔

(۳) الفاظ کا انتخاب ایسا ہے کہ نہ وہ ٹکسال باہر ہیں، اور نہ ایسے جن سے کان آشنا ہوں، بالفاظ دیگر شوکت الفاظ کا وہ عالم ہے کہ کہیں بھی فصاحت سے تجاوز نہیں۔

(۴) جملوں کی ترکیب شاندار ہونے کے باوجود کم سے کم الفاظ میں بلند سے بلند خیالات کا اظہار ہوا ہے۔

(۵) اظہار خیال ایسے مختصر جامع مگر سلیس الفاظ میں کیا گیا ہے کہ معمولی سمجھ کا آدمی بغیر کسی دقت کے قرآن کا مفہوم سمجھ سکتا، ....

(۶) قرآن میں وہ باریک بینی، لچک اور تنوع ہے کہ وہ اسلامی علوم و فنون کے علاوہ شریعت و فقہ کی بنیاد کا کام بھی دیتا ہے۔

(۷) نفسیات کا یہ قانون ہے کہ عقل اور جذبات باہم متضاد ہوتے ہیں، مگر قرآن کی عبارت اس قانون سے بالاتر ہے، کیونکہ وہ مافوق البشر ہستی کی بنائی ہوئی ہے، قرآن میں عقل اور جذبات کی باہم متضاد قوتوں میں حیرت انگیز ارتباط پایا جاتا ہے، اور قرآن میں عبارت کی متانت اور عظمت حیرتناک طریقہ پر برقرار رکھی گئی ہے،

اور یہ کہیں بھی ٹوٹنے نہیں پاتی ہے۔

(۸) جب ہم کسی ایسے جملہ یا چند جملوں کی ساخت سے گذر کر جو ایک ہی مضمون پر مشتمل ہوں غور کرتے ہیں، بلکہ بحیثیت مجموعی پورے قرآن کی ہیئت ترکیبی پر غور کرتے ہیں، تو ہم ایک ایسا مرتب نقشہ یا منصوبہ پاتے ہیں، جو انسانی دماغ کی پیداوار نہیں ہو سکتا ہے۔

اسلام کی بے پناہ اشاعت بھی قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کا ایک ثبوت ہے، جیسا کہ ایک مشہور مصنف اور فلسفی کہتا ہے، قرآن کے آسمانی کتاب ہونے کا ثبوت نہ صرف اس کے پیش کردہ عقائد، اس کی نفسیاتی اور مابعد الطبیعیاتی صداقت اور جادو بیانی سے ہوتا ہے، بلکہ اس کے بیرونی اثرات اور اسلام کی معجزانہ اشاعت سے بھی یکساں طور پر ظاہر ہوتا ہے۔

قرآن نے پہلے سے ہی پیشین گوئی کر دی تھی، کہ اسلامی تحریک کن کن مراحل سے گزرے گی، (سورہ ۴۴) مخالفین کے ردعمل کی پیشین گوئی ہو چکی تھی، کہ کس طرح وہ ابتدا میں بے فکر رہیں گے، پھر کچھ موافقت اور دلچسپی کا اظہار کریں گے، پھر مخالفت اور دشمنی پر اتر آئیں گے، پہلے اور سخت مقابلہ میں اہل مکہ کی مسلمانوں کے ہاتھ شکست ہوگی، قرآن نے اس کی بھی پیشین گوئی کر دی تھی کہ اسلام کی فتح ہوگی، اس کے عقائد اٹل اور ابدی ہیں، اس کی نوزائیدہ حکومت ترقی پذیر رہے گی، اور دنیا کی کوئی طاقت اسلام کو صفحۂ ہستی سے مٹا نہیں سکتی ہے، (۱۳-۱۸، ۱۴-۲۴ و ۵۵ و ۸-۳۶) اسلامی مشن کے انصرام حتی کہ پیغمبر اسلام کی وفات کا پیشگی سے اعلان ہے، کوئی چیز گڑھی ہوئی نہیں ہے، بلکہ ہر تفصیل ایک بے داغ منصوبہ کا جزو لاینفک کا کام دیتی ہے،

قرآن جستہ جستہ طور پر حسب ضرورت تیس (۳۰) سال کی مدت میں نازل ہوا، قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ ہر سورہ یا آیہ نہ صرف پیدا شدہ حالات کے متقاضی تھی، بلکہ قرآن کے پورے پلان کے مطابق بھی تھی، جیسے جیسے قرآن نازل ہوتا گیا، آیتوں و سورتوں کو ترتیب دینے کا کام ہوتا گیا، اور آیتوں کی نمبر اندازی کردی گئی، ہر آیت کے دو سلسلے ہیں، ایک بحسب تنزیل اور دوسرا بحسب ترتیب، سلسلۂ نزول کے اعتبار سے ہر آیت اس وقت کی ضروریات کے لائق تھی، اور پورے پلان کے لحاظ سے ہر آیت ماقبل آیت اور بعد کی آیتو سے مربوط ہوتی گئی، سلسلۂ تنزیل کے اعتبار سے آیتوں میں رابطہ، تسلسل، ہم آہنگی، اور منطقی ارتقا تھا، اور جب اس ترتیب سے بالکل مختلف ترتیب میں آیتوں کو پرو دیا گیا، تب بھی اتنا ہی اعلیٰ رابطہ، تسلسل، ہم آہنگی، اور منطقی ارتقا پایا جاتا ہے، اگر یہ غور کیا جائے کہ قرآن میں ۱۱۴ سورتیں ہیں، اور ان میں سے زیادہ تر سورتیں ایسی ہیں، جو مختلف سنین میں جستہ جستہ اور کئی کئی سال کے وقفہ سے نازل ہوئیں، تو استعجاب حیرت میں بدل جاتا ہے، یہ انسانی کام نہیں بلکہ معجزہ ہے، یہ بالکل ظاہر ہے کہ اگر کوئی بھی مصنف پہلے سے ایسا کوئی خاکہ یا منصوبہ بنائے، تو اس کے لیے یہ جاننا ضروری ہوگا کہ آیندہ ۲۳ سال میں کیا کیا واقعات رونما ہوں گے، کون کون سے مسائل درپیش ہوں گے، الفاظ کی کیسی موسیقیت ہوگی، آنے والی آیتوں کا اس خاکہ میں کون کون سا مقام ہوگا، ظاہر ہے کہ قرآن کا مصنف خدائے عالم الغیب کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔

قرآن کوئی سائنس کی کتاب نہیں ہے، مگر وہ بہت سے مظاہر قدرت کی نسبت اشارے یا معلومات بہم پہنچاتا ہے، جن کے متعلق انسان کو صدیوں بعد تک مطلق کوئی علم نہیں تھا، چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

زمین کی گولائی اور گردش (۳۹ - ۴۵۱)

مینہ کی تشکیل، (۳۰ - ۴۸)

ہوا کے ذریعہ نر و مادہ پھولوں کے تولیدی مادہ کا اتحاد، (۱۵ - ۲۲)

تمام اشیاء میں نر و مادہ کا وجود، (۳۲ - ۳۵)

چاند سورج اور سیاروں کا مقررہ برجوں میں گردش، (۳۶ - ۲۹ تا ۳۸)

سورج کی از خود روشنی اور چاند کا اس کی روشنی سے منور ہونا۔

تمام جانداروں کا آبی ماخذ، (۳۰ - ۲۱)

شہد کی مکھیوں کا طرز زندگی، (۱۶ - ۹۶)

بچہ کی رحم مادر میں تدریجی تشکیل اور اس کے تین پردوں میں رہنا، (۲۳-۲۲-۱۴)

اس کے علاوہ واقعہ یہ ہے اور قرآن خود گواہی دیتا ہے، اور تمام مستشرقین کو تسلیم ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے، یعنی پڑھے لکھے نہ تھے، لیکن اپنی ہٹ دھرمی اور قرآن کے آسمانی کتاب ہونے کے انکار میں مستشرقین پھر بھی کہتے ہیں، کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تخلیق ہے، قرآن نے کتنے متنوع مضامین، کتنی اعلیٰ اور بنیادی باتوں پر روشنی ڈالی ہے، اوس نے پہلی بار اللہ تعالےٰ کی یکتائی اور اس کا ماورائی تصور اسطرح پیش کیا ہے، کہ دلوں میں خدا کے وجود کا متحرک احساس پیدا ہو جائے، اس کی حکومت اور اقتدار اعلیٰ پوری کائنات کا ایک مفصل اور مربوط منصوبہ جس میں تمام مظاہر فطرت کا خاص قوانین کے تحت کارفرمائی، انسان اس کے خالق کے درمیان ایک مابعد الطبیعیاتی رشتہ، انسان کے روحانی اور مادی پہلوؤں میں امتزاج۔ ایک مکمل دستور حیات کے تمام بنیادی اصول، روح انسانی کا تخلیق کے وقت سے لیکر ابد تک

کی زندگی، اور اس کے مراحل، اس کا عقائد اور اعمال اور خیالات اور کردار میں صدق
پر زور دینا، انسان کا بحیثیت اشرف المخلوقات درجہ و مرتبہ، عقل و فہم کے استعمال پر زور،
انسان کے بنائے ہوئے امتیازات کی نفی جو فرقہ، نسل و رنگ وغیرہ پر مبنی ہوں پوری
انسانیت کا ایک برادری ہونا، ایک نئی تہذیب اور تمدن کی داغ بیل ڈالنا،
اس کے اصول اور ہدایت کی ابدیت اور حقوق اللہ اور حقوق الناس پر زور اور
ان کی نسبت انسان کی ذمہ داریاں وغیرہ وغیرہ مضامین پر بحث کی گئی ہے دنیا کا
بڑے سے بڑا دانشور اور ادیب ایسی کتاب نہیں لا سکتا ہے، ایک ان پڑھ آدمی
کا ذکر کیا، جارج سیل کو بھی تسلیم ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم یافتہ نہیں تھے،
مگر وہ پھر بھی کہتا ہے، کہ قرآن کے مصنف وہی تھے، اور ہو سکتا ہے، کہ انھوں نے
یہودیوں اور عیسائیوں کی صحبت میں یہ تمام علم حاصل کر لیے ہوں، حالانکہ مکہ معظمہ
میں اگر کچھ عیسائی یا یہودی تھے تو وہ معدودے چند رہے ہوں گے، انکی جو تعداد بتائی
جاتی ہے وہ بالکل ناقابل اعتبار ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے، کہ قرآن میں جو رشد و ہدایت پر
جا بجا زور ہے، وہ حضورؐ کی سیاحت اور سفر کا نتیجہ ہے مستشرقین نے قیاس آرائی کی
ہے، کہ تمام الہامی باتیں حضورؐ نے ایک عیسائی پادری بحیرہ کی ایک روزہ ملاقات
سے حاصل کیں، یا انجیل و تورات کے قصص سے حاصل کیں، حالانکہ اس کو تسلیم ہے،
کہ یہ کتابیں حضورؐ کو دستیاب نہیں تھیں، اور نہ اس وقت تک ان کا عربی زبان
میں ترجمہ ہوا تھا، ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی کہتا ہے، کہ جو کچھ حضورؐ نے ان آسمانی
کتابوں سے حاصل کیا اس کو ایک نئے انداز میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنے طور
پر پیش کر دیا، جو ایک بہت اعلیٰ مصنف اور ادیب کا ہی کام ہو سکتا ہے، اس نے

اپنے بغض میں یہاں تک کہہ دیا کہ اہل قریش کی مخالفت اس بات کی دلیل ہے، کہ حضورؐ نبی
نہیں تھے، حالانکہ ایک قلیل مدت میں قریش کے بچہ بچہ نے اسلام قبول کر لیا تھا،
قرآن اور دوسری کتب الٰہی میں ابتدائے آفرینش، حضرت آدمؑ کی تخلیق، ان کا
جنت سے نکالا جانا، انبیاء علیہم السلام کے قصص، جنت اور دوزخ، دنیوی اور ابدی
زندگی کے تذکروں میں جو مماثلت ہے، اس سے مستشرقین نے یہ نتیجہ نکالا کہ حضورؐ نے
تمام باتیں دوسرے مذاہب سے اخذ کیں، انھوں نے یہ بات بالکل نظرانداز کر دی
ہے کہ خالق کائنات ایک ہے، انسانیت اور اس کی بنیادی ضرورتیں ایک ہیں،
ابدی حقائق اور تمام انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ نازل پیغام خداوندی اپنی اصلی شکل
میں ایک ہے، اور اگر ہر نبی کے زمانے میں ان کی تالیف ہو جاتی، اور دوسری کتابوں
میں تحریف، اضافہ، تغیر و تبدل نہ کیا گیا ہوتا تو مماثلت ہی نہیں، ان سب کی شکل
ایک ہی ہوتی، اور صرف شریعت میں معاشرہ میں تدریجی ارتقاء کے اعتبار سے تھوڑا
بہت فرق ہوتا۔

ان تمام باتوں اور دلائل کے پیش نظر کوئی معمولی سمجھ کا آدمی بھی قرآن عظیم کے
کتاب الٰہی ہونے سے انکار نہیں کر سکتا ہے، ہٹ دھرمی بغض اور بے دردی کی بات دوسری ہے،
مستشرقین نے اسلام پر یہ بھی الزام لگایا، کہ وہ صرف قضاء و قدر پر زور
دیتا ہے، اور انسان کی ذاتی فکر و کوشش کو سلب کر لیتا ہے، چنانچہ سر ولیم میور کہتے ہیں
اسلام میں اللہ کا رشتہ دنیا کے ساتھ اس طرح ہے، کہ انسان کا اختیار اور ارادہ ختم
ہو جاتا ہے، اور امید اور توقع اللہ کے آہنی شکنجہ میں ہلاک ہو جاتی ہے، اس طرح
Clarke کہتا ہے کہ اسلام نے خدا کو دیکھا، انسان کو نہیں، اللہ کے حقوق جانے مگر

انسان کے حقوق کو نہ جانا، اس نے جبر اور اقتدار دیکھا آزادی نہیں، اور اس وجہ سے ایک استبدادی ضابطہ بن گیا، جو سخت ہو کر آہنی ڈھانچہ رہ گیا، اور بالآخر ہلاک ہو گیا۔

یہ الزام سراسر بے بنیاد اور لغو ہے، اور صرف بغض اور عناد پر مبنی ہے، اسلام کے نظریات اور تاریخ کے خلاف ہے، اور جناب کلارک کی بدخواہی کے باوجود اسلام حیرت انگیز طریقہ سے پھیلتا گیا اور زمانہ اس کی طرف آرہا ہے، اللہ تعالیٰ قادر مطلق ضرور ہے، اور کائنات کی ہر شے تابع تقدیر ہے، اسی نے ہر شے کو اس کی صفت دی، اور اسی قانون سے وابستہ ہے، جو اس کے لیے اس نے مقرر کیا، انسان بہت حد تک تابع تقدیر ہے، مگر اس کو بہت حد تک آزادی بھی ملی ہے، ہر شخص کے ضمیر اور فطرت میں یہ تمیز دی گئی ہے کہ وہ اچھائی، اور برائی میں تمیز کر سکے، اور اس کو نیکی کے راستے پر چلنے کی ہدایت دی گئی مگر یہ اس پر ہے کہ وہ کون سا طریقہ اختیار کرتا ہے، اچھا اور برا، اس کے اچھے کی جزا اور برے کی سزا سے بھی آگاہ کر دیا گیا ہے، مگر اسے مجبور نہیں کیا گیا، کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرتا ہے، تقدیر الٰہی کہیں کہیں علم الٰہی سے متعلق ہے، جو ہر شے کے متعلق اللہ تعالیٰ کو پہلے سے ہے، کہ وہ کیا کرے گا، اور کہیں کہیں اس قانون سے جس کے تحت اس کی پیدائش، اس کی نمو، اس کی بقا اور اس کا وجود ہوا ہے،

قرآن عظیم میں بے شمار ایسی باتیں ہیں کہ انسان کو خود کوشش کرنی ہوگی اسے وہی ملے گا جو وہ کرے گا اور انسان کو اپنی عقل وفہم سے کام لے کر اور مظاہر قدرت کا بغور مشاہدہ کر کے گذشتہ قوموں کے واقعات اور حشر سے عبرت لے کر خدا کی قدرت کو سمجھنا ہے، اور اسکی تابعداری اخلاص وانہماک سے کرنی ہے، اور اس سے اپنی امیدوں کو وابستہ کرنا ہے، جو اس کا رب ہے بڑا دوست، نگہبان، پرورش کرنے والا، ہدایت دینے والا اور مہربان ہے، بطور نمونہ کے

چند آیتیں لے لیجئے۔

سورہ ۵۳ کی ۳۹ آیت ہے کہ انسان کو وہی ملے گا، جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے یا سورہ ۱۳ کی گیارہویں آیت کہ خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا ہے، جب تک وہ خود اپنی حالت کو بدلتی نہیں ہے، یا سورہ ۶۲ کی دسویں آیت کہ جب نماز ختم ہو جائے تو خدا کی نعمت حاصل کرنے کے لیے زمین میں منتشر ہو جاؤ اور خدا کا ہر وقت خیال رکھو، تاکہ فلاح پاؤ،

ان مستشرقین کا یہی حال ہے جس کے متعلق قرآن نے پیشگی اعلان کر دیا ہے ان کے دماغ ہے، مگر سوچتے نہیں، ان کے آنکھیں ہیں، مگر دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں مگر سنتے نہیں، (سورہ، آیت ۱۷۹) اور جن لوگوں نے دنیا میں حقیقت سے چشم پوشی کی وہ آخرت میں بھی اندھے اٹھیں گے، اور صحیح راستہ سے بہت دور ہوں گے (سورہ ۱۷، ۷۲) قرآن انہی کو ہدایت دیتا ہے جو اس کے طلب گار ہیں،

جارج سیل Arberry Rodvell Richra Bell Dherry اور PickThall نے قرآن کے ترجمہ میں جو غلطیاں کی ہیں، ان کے چند نمونے میں نے اپنے انگریزی کتابچہ میں پیش کیے ہیں، اس مختصر مقالہ میں انھیں دہرانا ممکن نہیں ہے، انھوں نے جو غلطیاں کی ہیں، وہ عبارت کی ہیں، اور عربی زبان، قرآن کے اسلوب بیان اور عربی محاوروں سے پوری واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے کی ہیں PicKThall کی غلطیاں ترجمہ میں اصل کی طرح موسیقیت و نغمہ لانے کی کوشش کی وجہ سے ہوئیں، اور کچھ عربی محاوروں سے ناواقفیت کی بنا پر ہوئیں، اور دوں نے دیدہ و دانستہ اور بدنیتی سے فاش غلطیاں کیں۔

براؤن اور اسلام

از

ڈاکٹر امیر حسن عابدی شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی

فارسی سے پہلے یورپ میں عربی کی ابتدا ہوئی، جس کے ذریعہ سے یونانی فلسفہ خاص کر ارسطو کے خیالات سب سے پہلے مغربی یورپ کو معلوم ہوئے، تیرہویں صدی عیسوی میں البرٹس میگنس نے فارابی اور ابن سینا کی کتابوں سے اخذ کرکے ارسطو کی تعلیمات کو پیرس میں پیش کیا، اسی صدی میں راجر بیکن اور ریمانڈ لل نے مشرقی زبانوں سے واقفیت حاصل کرنے پر زور دیا، تاکہ ان کے فلسفہ اور سائنس کا مطالعہ ہو سکے،

چودھویں صدی کے شروع میں پانچویں پوپ نے یورپ کے مختلف شہروں میں عربی وغیرہ کی پروفیسر شپ قائم کروائی، مگر اس کا خیال رکھا گیا، کہ اس کے عیسائی مذہب کو کوئی نقصان نہ پہونچے، سولہویں صدی کے شروع میں باقاعدہ یورپ میں مشرقی علوم کا باقاعدہ چرچا اور رواج ہوا، آج دنیا پر مسلمانوں کا یہ احسان ہے کہ انھوں نے یونانی علوم و فنون کو زندہ رکھا، اور آج یورپ والے ان ہی کے عربی ترجموں سے استفادہ کرکے آگے بڑھے ہیں،

یورپ میں عربی، فارسی، وغیرہ جیسے مشرقی علوم کی طرف توجہ کرنے کے دو اسباب تھے، ایک تو یہ کہ ان زبانوں، خاصکر عربی کے ذریعہ سے وہ یونان اور خاص کر سقراط افلاطون اور ارسطو وغیرہ کے فلسفہ کو سمجھ سکیں، دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ وہ اسلام، قرآن اور مسلمانوں میں طرح طرح کی خامیاں اور کمزوریاں دکھا کر ان پر کیچڑ اچھالیں، پھر بھی بہت ایسے مستشرق ہیں جنھوں نے اسلام اور اسلامی علوم و فنون کا مطالعہ بڑی دیانتداری سے کرکے ان سے پورا پورا استفادہ کیا، اور مسلمانوں کی علمی دین کے معترف ہوئے، پروفیسر ایڈورڈ جی براؤن کا شمار انہیں مستشرقین میں کیا جانا چاہئے، انھوں نے فارسی ادب کی تاریخ لکھنے میں مسلمانوں کی خدمات کا صحیح جائزہ لیا، اور اپنے کو ایک سچے ایماندار محقق کی حیثیت سے پیش کیا، انھوں نے ابن ہشام، الطبری، دینوری، بلاذری، مسعودی، یعقوبی وغیرہ کے حوالے سے اپنی تحقیقات کی تکمیل کی،

وہ لکھتے ہیں کہ نوشیرواں کی شاندار حکومت (۵۳۱ء - ۵۷۸ء) کے زمانہ میں سب سے زیادہ اہم اس کا بیالیسواں سال (۵۷۲-۳ء) جسے عرب عام الفیل کہتے ہیں، اسی سال ایک طرف تو ایران نے یمن کی سلطنت پر فتح پائی، مگر دوسری طرف مکہ معظمہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی، جن کی تعلیمات کے نتیجہ میں ساسانی سلطنت کا خاتمہ ہوا

یہاں یہ بھی لکھ دیا جائے کہ خسرو انوشیرواں (۵۳۱ء - ۵۷۸ء) سخت قسم کا جابر ظالم اور سفاک بادشاہ تھا، جس نے زرتشتی مذہب کے علاوہ کسی مذہب و ملت کو پنپنے نہیں دیا۔ بلکہ سب کا قلع قمع کر دیا، مزدک اپنے زمانہ کا کمیونسٹ تھا، ۵۳۲ء میں اس کا خاتمہ کرکے اس کی تحریک کو کچل کر رکھ دیا۔ عیسائیوں کو وہ بڑی حقارت سے دیکھتا تھا، مانی

آخری اشکانی بادشاہ اردوان کے چوتھے سال (۲۱۵-۱۶ء) میں پیدا ہوا، اس کے دین یعنی مذہب مانی کو زرتشتیوں نے کچلا، پھر بھی تیرہویں صدی تک اس کے ماننے والے موجود تھے، مگر زرتشتیوں کا اُس نے پورا احترام کیا، اور انھیں ہر طرح کی سہولتیں دیں، نیز ان کے لئے وہ بڑا مہربان اور عمدہ بادشاہ تھا، اسی لئے انھوں نے اسے نوشیروان عادل کا خطاب دیا، جو آج ہماری روایتوں کا جزو بن گیا ہے،

بہرحال ایک طرف تو براؤن نے نوشیرواں کو کٹر متشدد اور متعصب بتلایا ہے مگر دوسری طرف اُسے مامون الرشید اور اکبر جیسے بادشاہوں کا ہم پلّہ قرار دیا ہے، اس لئے کہ اس نے سات نو افلاطونی فلسفیوں کو جنھیں شہنشاہ جسٹینین نے اپنے وطن سے نکال دیا تھا، پناہ دی،

بہرحال پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے براؤن لکھتے ہیں کہ آپ کا کام بہت مشکل تھا، اس لئے کہ ریگستان عرب دل سے مادہ پرست اور متشکک تھے۔ انھیں ماورا الطبیعیات اور الٰہیات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، نیز انھیں ایسے خدا کی ضرورت نہیں تھی، جو طاقتور تو ضرور ہو مگر اُن سے خدمت اور نفی ذات کا خواہاں ہو،

براؤن کے نزدیک ہجرت (۶۲۲ء) سے لے کر حضرت عمرؓ کی وفات (۶۴۴ء) تک کا زمانہ مقدس اسلام کا سنہرا عہد ہے، جو فلسفی اسلام سے جدا اور الگ ہے،

ایران پر عرب حملہ کے باب میں براؤن نے ڈوزی کی کتاب کی بڑی تعریف کی ہے، اس سے ایک طویل عبارت نقل کی ہے، جس کے کچھ حصے یہاں دیئے جا رہے ہیں وہ لکھتا ہے:

"ساتویں صدی کے پہلے نصف حصہ میں بزنطینی اور ایرانی۔۔۔۔ حکومتیں مغربی ایشیا پر قبضہ کرنا چاہتی تھیں، بظاہر دونوں سلطنتیں تمکنت کی وجہ سے بہت خوش نظر آ رہی تھیں، اور ان کی شان و شوکت، ان تعیش کی زندگی ایک

مثل بن گئی تھی، لیکن اندر سے ایک مرض نے دونوں میں گھن لگا دیا تھا، لوگ مطلق العنانیت کے بوجھ کے نیچے دبے جا رہے تھے، دونوں شاہی خاندانوں نے مسلسل دہشت پھیلا رکھی تھی، اور مذہبی تعصب کی وجہ سے لوگوں کو اذیتیں دی جا رہی تھیں، کہ اچانک عرب کے ریگستان سے کچھ نئے لوگ نمودار ہوئے، جو اس سے قبل بے شمار قبیلوں میں بٹے ہوئے اور باہمی جنگ و خونریزی میں مبتلا تھے، مگر اب سب ایک ہو گئے تھے یہی لوگ تھے جو آزاد، لباس و غذا میں سادہ، شریف اور مہمان نواز اور سمجھدار تھے لیکن اسی کے ساتھ وہ ایسے غیور اور خود دار، تند مزاج، انتقام جو سخت دشمن سفاک اور ظالم بھی تھے، کہ دیکھتے دیکھتے قابل قدر، نگہ بھڑ سی گئی: ایرانی سلطنت کا خاتمہ کر دیا، قسطنطنیہ کے جانشینوں سے ان کے اچھے صوبے چھین لئے، ٹیوٹنی نسل کی حکومت کو اپنے قدموں سے کچل دیا، اور بقیہ یورپ میں ایک وحشت پھیلا دی، دوسری طرف اُن کی فاتح فوجیں ہمالیہ میں داخل ہو گئیں، پھر بھی یہ دوسرے فاتحوں کی طرح نہ تھے، اس لئے کہ یہ ایک نئے مذہب کی تبلیغ کر رہے تھے، ایرانیوں کی ثنویت اور بگڑی ہوئی عیسویت کے خلاف انھوں نے وحدت کا اعلان کیا، جسے لاکھوں آدمیوں نے قبول کیا، اور جو آج بھی انسانوں کے دسویں حصہ کا مذہب ہے"،

براؤن نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی، خلفائے راشدین کا عہد حضرت عثمانؓ کے قتل حضرت علیؓ کی خلافت اور معاویہ کا اس سے انکار، جنگ صفین و جمل و نہروان، خوارج، معاویہ کے ساتھ صلح اور امام حسنؓ کی خلافت سے دست برداری، یزید، معرکۂ کربلا، ابن زبیرؓ اور مختار کی بغاوت، عبدالملک کی حکومت، حجاج کے مظالم، لوگوں کے بنی امیہ کے خلاف ہونے، بنی امیہ کے زوال

کے اسباب، عمر بن محمد العزیز اور بنی عباس کے پروپیگنڈے، ایرانیوں کا ان کے ساتھ ہونے، ابومسلم خراسانی، انقلابیوں کی آنکھ کھلنے، عباسی حکومت، برمکیوں، نوروز کے تہوار کے احیا وغیرہ کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے،

معتزلہ کے ذکر میں براؤن نے دو مستشرق ڈوزی اور اسٹینر کا حوالہ دیا ہے جنہوں نے ان کے متعلق بحث اور تحقیق کی ہے، براؤن کے خیال میں شروع ہی سے معتزلہ یونانی فلسفہ سے متاثر تھے، اُن کا خیال ہے کہ عباسی خلیفہ متوکل (۸۴۷ء تا ۸۶۱ء) کی تخت نشینی پر وہ سیاسی حیثیت سے ختم ہو گئے، لیکن ان کے دبستان خیال کی تین سو سال بعد بھی زمخشری جیسے مفسر قرآن نے نمائندگی کی ہے، اس مستشرق نے متوکل کے عہد کو تقلید پسندی کا زمانہ کہا ہے، پھر بھی اشعریوں کے مقابلہ میں اس عہد کو ذہنی قابلیت کے لحاظ سے بلند قرار دیا ہے، اس مستشرق نے ابوالحسن اشعری کا ذکر کر کے ان کے بزرگ ابوموسیٰ اشعریؓ کو بے عقل کہکر یاد کیا ہے،

اخوان الصفاء کو براؤن نے غیر معمولی جماعت قرار دیا ہے، اس سلسلہ میں فلوگل اور ڈیٹریسی جیسے مستشرقوں کے حوالے دے کر ان کا اچھا تعارف کرایا ہے، ان کا خیال ہے کہ اخوان الصفا نے معتزلہ کے کاموں کو آگے بڑھایا، اور انھوں نے سائنس اور مذہب، اسلام اور یونانی فلسفہ میں تطبیق کی، اور تمام علوم کو ملا جلا کر ایک انسائیکلوپیڈیا پیدا کر دیا،

براؤن نے زرتشتیوں کے صاحب کتاب ہونے کے مسئلہ کو بھی اٹھایا ہے، اور اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جمشید کو حضرت سلیمانؑ بتلایا گیا ہے، اسی طرح کوروش کی قبر کو مسجد مادر سلیمان اور مرغاب کی ایک تاریخی یادگار کو تخت سلیمان کہا گیا ہے، ان کے خیال میں یہ سب اس لئے کیا گیا تھا کہ ابتدائے اسلام میں زرتشتی یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں سے اپنی

قدر و قیمت میں اضافہ کرائیں، اور اپنے کو اہل کتاب کہلوائیں، لیکن ابن مقفع جیسے دانشور نے بہت پہلے اس قسم کی باتوں سے انکار کیا ہے، حضرت عمرؓ کو مجوسیوں کے ساتھ اہل کتاب جیسا سلوک کرنے میں جھجک ہو رہی تھی، لیکن عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے اُن سے کہا کہ میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، کہ ان کے ساتھ وہی سلوک ہونا چاہئے جو اہل کتاب کے ساتھ ہوتا ہے،

ساسانی بادشاہ اپنے کو خدا کی طرف سے نامزد سمجھتے تھے، اور زرتشتیوں کے عقیدہ کے مطابق ان کو خداداد حقوق حاصل تھے، یہی عقیدہ اور اس قسم کے دوسرے زرتشتی اور ایرانی عقیدے مسلمانوں کے بعض فرقوں پر اثر انداز ہوئے ہیں، اس کے علاوہ چونکہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ساسانی سلطنت کا خاتمہ ہوا، اس لئے اُن کے خلاف ایرانی جذبات کارفرما تھے، اس کے برخلاف ایرانیوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت امام حسینؑ کی شادی یزدگرد سوم کی صاحبزادی شہر بانو سے ہوئی جن سے نو امام عالم وجود میں آئے، اس طرح بقیہ امام حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور ساسانی بادشاہوں کی اولاد سے ہوئے، اور وہ بھی خدا کی طرف سے امامت کے لئے نامزد ہوئے تھے، ایران میں حضرت شہر بانو بڑے احترام سے دیکھی جاتی ہیں، اُن کے نام سے ایک پہاڑ بھی ہے جس کو کوہ بی بی شہر بانو کہا جاتا ہے، اور جو تہران سے ۳/۴ میل جنوب میں ہے،

آگے چل کر براؤن نے زندیق کی بحث اٹھائی ہے، جو دراصل مانی مذہب کے ماننے والے تھے، آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر میں وہ اتنے فعال ہو گئے تھے، کہ عباسی خلیفہ المہدی (۷۷۵ء تا ۷۸۵ء) نے ایک مخصوص مفتش مقرر کیا جو زندیقوں کا پتہ لگائے جو بظاہر اسلام کے مبلغ ہونے کا دعویٰ کرتے مگر درحقیقت مانی مذہب کا پروپیگنڈا کرتے تھے، ان میں سے بعض کو اموی اور عباسی خلفاء نے قتل بھی کروا دیا تھا،

براؤن کے نزدیک ایران کی فتح کے بعد عربوں کے لئے زیادہ مشکل کام اسلام کے

زرتشتی مذہب پر بتدریج غلبہ اور فتح حاصل کرنا تھا، عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے، کہ اسلامی فاتحین نے لوگوں کے لئے قرآن اور تلوار کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں چھوڑا تھا، لیکن براؤن کے نزدیک صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ مجوسیوں، عیسائیوں اور یہودیوں کو اجازت دی گئی تھی، کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہ سکتے ہیں، البتہ انھیں جزیہ دینا ہوگا، اُن کے نزدیک یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ زرتشتیوں پر کوئی خاص سختی کی گئی ہو، یا ایران کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا ہو، بلکہ بیشتر مذہب کی تبدیلی اختیاری تھی۔

عام طور سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسلامی فتح کے بعد تین سو سال تک ایران ذہنی طور سے کورا تھا، لیکن براؤن کے خیال میں یہ زمانہ نئے اور پرانے امتزاج اور خیالات کے حلول اور تناسخ کا زمانہ ہے، سیاسی اعتبار سے ایران مستقل اور آزاد نہ رہا ہو، لیکن ذہنی اور عقلی میدان میں اس کی بلندی قائم رہی، اس لیے کہ علم کے ہر شعبہ میں ایرانیوں نے نمایاں حصہ لیا،

براؤن نے اپنی کتاب میں سر ولیم میور، ڈاکٹر گسٹو ویل، گولڈ زیہر، وان والٹن اور دوسرے بہت سے مستشرقوں کا ذکر کیا ہے، جن سے انھوں نے استفادہ کیا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ بہت سے اسلامی علماء کا بھی ذکر کیا ہے، جن کے تبحر علمی اور وقت نظر کا انھوں نے اعتراف کیا ہے، ان میں سے ایک علامہ شبلی نعمانی بھی ہیں، جن کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ "جہاں تک میں فیصلہ کر سکتا ہوں، شروع سے لے کر ستر ہویں صدی کے آخر تک ممتاز فارسی شعراء کا سیر حاصل اور بہترین تبصرہ (انتہائی بدقسمتی سے) اردو یا ہندوستانی زبان میں لکھی ہوئی علامہ شبلی نعمانی جیسے ممتاز عالم کی شعر العجم ہے۔"

اُن کی اس سخت رائے سے ہم میں یہ احساس ہونا چاہیئے کہ ہمارے بزرگوں کے کارنامے بہتر سے بہتر شکل میں دنیا کے مستشرقین کے سامنے پیش کئے جائیں،

ضرورت ہے کہ علامہ شبلی نعمانی کی منتخب تصنیفات کو دنیا کی زبانوں خصوصاً انگریزی میں ترجمہ کیا جائے تاکہ دوسری زبانوں کے لوگ بھی ان سے پورا پورا استفادہ کر سکیں،

کروبی اور کروبیان کے بارے میں تحقیق

از

ڈاکٹر محمد سلیم اختر دی آسٹریلین نیشنل یونیورسٹی، کینبرا، آسٹریلیا۔

لفظ کروبی یا اس کے زیادہ معروف صیغہ جمع کروبیان کا قدیم ترین، متفق علیہ اور معلوم سرچشمہ عہد نامہ عتیق بزبان عبرانی ہے، جہاں یہ لفظ بصورت کروب اور اس کی عبرانی قواعد کے رو سے جمع کروبیم دونوں ملتے ہیں[۱]، بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ لفظ پہلے پہل سرزمین آشور، میسوپوٹیمیا میں انسانی سر اور حیوانی دھڑ والے اُن پر دار مجسموں کے لیے استعمال ہوتا تھا جو عبادت گاہوں اور محلات کے دروازوں کے باہر محافظین کے طور پر نصب کیے جاتے تھے، وہاں سے یہ لفظ کنعانی ذرائع سے عبرانی زبان میں وارد ہوا[۲]، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بحث ابھی تک کسی فیصلہ کن نتیجے پر نہیں پہونچ سکی[۳]، بہرحال اتنا مسلم ہے کہ عبرانی زبان

---

۱. THE OXFORD ENGLISH DICTIONARY (A NEW ENGLISH DICTIONARY ON HISTORICAL PRINCIPLES), OXFORD, 1933 Vol VI, P. 325

۲. THE ENCYCLOPEDIA AMERICANA, NEW YORK, 1960, Vol. VI, P. 420

۳. THE ENCYCLPEADIA OF RELIGION AND ETHICS, ed. James Hastings

میں بھی چونکہ اس لفظ کی صحیح وجہ تسمیہ اور ریشہ پوری طرح روشن نہیں تھے، یہ لفظ یورپین زبانوں میں جہاں کا توں بلا ترجمہ منتقل ہونے لگا، نقل و انتقال کے اس عمل میں اتفاقاً جمع کا صیغہ زیادہ مورد التفات قرار پایا، چنانچہ ان زبانوں نے اپنے متوازی الفاظ کی اساس اسی کو قرار دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لہجوں کے ادنیٰ اختلاف سے اطالیائی اور اسپانیائی زبانوں میں یہ لفظ بالترتیب CHERUBINO اور HERUBIN بن گیا، جب کہ فرانسیسی، پرتگیزی اور لاطینی میں CHERUBIN کہلایا۔[1]

انگریزی میں یہ لفظ CHERUBIN لاطینی زبان کے راستے وارد ہوا، اور ایک عرصہ تک اس کے ساتھ ایک اجنبی کا سا سلوک ہوتا رہا، کبھی اس سے مفرد کے معنیٰ مراد لیے گئے، کبھی اسے جمع کی جگہ کھڑا کر دیا گیا، اور کبھی اس کے سر پر اسم معرفہ کا تاج رکھ دیا گیا، پھر انجیل مقدس کے تراجم کے دوران رفتہ رفتہ اس کی جگہ CHERUB اور CHERUBINS کی بجائے پہلے CHERUBIMS اور پھر CHERUBIM استعمال ہونے لگے، اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے CHERUB کا صیغۂ جمع CHERUBS بھی معرض وجود میں آگیا۔[1]

مغربی زبانوں کے برعکس عبرانی کے عربی سے قریب ہونے کے باعث لفظ کروب من و عن موخر الذکر زبان میں وارد ہوا۔[2] لیکن تداول کا شرف اس کے مترادف کروبی کو شاید زیادہ حاصل ہوا، عربی متون میں اس لفظ کے استعمال کی قدیم ترین مثال جس کا سراغ ہم لگا سکے ہیں، امام عبداللہ بن عمر بیضاوی (متوفی ۱۳۱۶/۶۱۶ء) کے یہاں ملتی ہے۔ سورۂ مومن کی ساتویں آیت:

اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ — جو لوگ عرش کو اٹھائے ہوئے اور جو اس کے گرداگرد حلقہ

یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ — باندھے ہوئے ہیں (یعنی فرشتے) وہ اپنے پروردگار کی تعریف کے

---

[1] THE OXEORD ENGLISH DICTIONARY .op.cM. ,p.325

[2] ایضاً، المنجد فی اللغۃ والعلوم، بیروت ۱۹۶۹، الطبعۃ العشرون، ص ۶۷۹۔

وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا... — ساتھ تسبیح کرتے رہتے ہیں اور مومنوں کیلئے بخشش مانگتے رہتے ہیں

کی تفسیر میں وہ لکھتے ہیں کہ کروبین سے مراد سب سے اعلیٰ درجہ پر فائز اور سب سے پہلے تخلیق ہونے والے فرشتے ہیں،[1] جن کی تعداد عرش خداوندی کے گرد بعض تفاسیر کے مطابق ستر ہزار ہے۔[2]

فارسی متون میں لفظ کروب بمعنی فرشتہ یا فرشتۂ مقرب کہیں دکھائی نہیں دیتا، اس کے برعکس کروبی اور اس کی فارسی جمع (کروبی باضافۂ علامت جمع: ان) کروبیان کے موارد استعمال کی کمی نہیں، مثالیں ملاحظہ ہوں:

حکیم سنائی غزنوی | برنہ قدم لے شمع دین، بر شہپر روح الامین ؛ کردیانت بر یمین، روحانیانت دست چپ[3]

---

[1] THOMAS PATRICK HUGHES, DICTIONARY OF ISLAM, NEW DELHI 1976 REPR., P.50, 11. Cf. THE ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION AND ETHICS. op. cit., P.512. ('JEWISH TRADITIONAL EXEGESIS ADDS LITTIE CONCERNING WHICH THERE IS GENERAL AGREEMENT BUT PRESERVES THE OPINIONS OF SEVERAL EXEGETICAL AUTHORITIES OR GROUPS OF AUTHORITIES THERE WAS A VIEW, BASED PROBABLY ON JOB 38 (7), THATANGELS, INCLUDING THE CHERUBIM WERE CREATED ON THE FIRST DAY, AND WERE INDEED THE FIRST THINGS CREATED; BUT THE VIEW NEVER BECAME GENERAL, THROUGH FEAR OF THE INFERENCE THAT CHERUBIM ASSOSTED God AT THE WORK OF CREATION).

[2] THOMAS PATRICK HUGHES, op. cit., P.50.

[3] دیوان حکیم سنائی، بکوشش دکتر مظاہر مصفا، تہران ۱۳۳۶ ہجری شمسی، ص ۴۰۔

همتِ کروبیان شعبدهٔ دستِ تست | سرمهٔ روحانیان، خاکِ کفِ پایِ تست[1]

عطار نیشاپوری | همه کروبیان پر برگشاده | بپر خاکِ رهش بر سر نهاده[2]
گفتی آن آب را که عرش بر وست | اشک کروبیان همی یابم[3]

انوری ابیوردی | حق میکال، خواجهٔ ملکوت | که ز کروبیان بهینه‌تر است[4]

خاقانی شروانی | ... گر ناظر چراغی گه منتظر آفتاب، نه زهش نور کروبیان در ذرهٔ گریبان تست، از چراغ مستعار چه همی طلبی؟ ...[5]

سعدی شیرازی | کسی بدیدهٔ انکار اگر نگاه کند | نشان صورت یوسف دهد بناخوبی
اگر بچشم ارادت نگه کنی در دیو | فرشته‌ایت نماید بچشم کروبی[6]
بتهدید اگر بر کشد تیغ حکم | بمانند کروبیان صم بکم[7]

نظیری نیشاپوری | ای از صفای دل همه خود صفا شده | بر مرز آفرینشِ ارض و سما شده
گلبانگِ حمد برده بکروبیانِ عرش | از کبریای حق همه تن کبریا شده[8]

میرزا مهدی خان استرآبادی | ... و زمانه از روی ترجیب و ترجیب بر جیب و گریبان کروبیان، از ذکر و بیان دعای دولتش ذیع شمیم شمامهٔ عنبر و ضوعِ بیضهٔ مشک اذفر کرد ...[9]

---

۱ دیوان حکیم سنائی، بکوشش دکتر مظاهر مصفا، تهران، ۱۳۳۶ شمسی ص ۹۷، ۲ اسرارنامه باهتمام دکتر سید صادق گوهرین تهران ۱۳۳۸ شمسی ص ۲۳، ۳ دیوان غزلیات و قصائد عطار باهتمام و تصحیح دکتر تقی تفضلی تهران ۱۳۴۱ شمسی ص ۲۷۰، ۴ شرح لغات و مشکلات دیوان انوری ابیوردی تالیف دکتر سید جعفر شهیدی تهران ۱۳۵۷ شمسی ص ۱۰۰، ۵ منشآت خاقانی از افضل الدین بدیل بن علی خاقانی به تصحیح و تحشیه محمد روشن تهران ۱۳۴۹ شمسی ص ۱۱۷، ۶ متن دیوان کامل شیخ اجل سعدی شیرازی بکوشش مظاهر مصفا تهران ۱۳۴۰ شمسی ص ۸۰۰، ۷ ایضاً ص ۱۳۷، ۸ دیوان نظیری نیشاپوری باهتمام مظاهر مصفا تهران ۱۳۴۰ شمسی ص ۵۷۷، ۹ درهٔ نادره تالیف میرزا مهدی خان استرآبادی باهتمام دکتر سید جعفر شهیدی تهران ۱۳۴۱ شمسی ص ۳۷۳۔

بسا اوقات لفظ کروبی اپنے اصل مفہوم یعنی مقرب کے معنوں[1] میں ملائکہ کی صفت کے طور پر بھی مورد استفادہ قرار پایا ہے، اس کی ہمیں صرف دو[2] مثالیں دستیاب ہو سکی ہیں۔

نظامی عروضی سمرقندی | حمد و شکر و سپاس مرآن پادشاهی را که عالم عود و معاد را بتوسط ملائکهٔ کروبی در وجود آورد[2]

خاقانی شروانی | یه ذات تا محسوس الٰهی و به ملائکهٔ کروبی ... که حضرت عظمی یگانگی را نصره الله تعالیٰ ... دولت خواه‌تر از بنده بر روی زمین کس نیست[3]۔

اردو زبان میں بھی جو بقول مولانا شبلی "فارسی کا دودھ پی کر پروان چڑھی ہے" بظاہر فارسی ہی کے زیرِ اثر یہ لفظ آیا ہے، اور اسے لاطینی الاصل[4] قرار دینا درست نہیں، اردو میں اس لفظ کے استعمال کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

---

۱ THOMAS PATRICK HUCHES, OP. cit. p. 50, 1.

۲ چهار مقاله تالیف احمد بن عمر بن علی نظامی عروضی سمرقندی، بکوشش دکتر محمد معین، تهران، ۱۳۳۳ شمسی، چاپ سوم، ص ۱ ۳ منشآت خاقانی ص ۲۳۱ ۴ ملاحظہ ہو، ڈاکٹر ریاض الحسن، "اردو میں ایک لاطینی لفظ"، ماہنامہ قومی زبان کراچی، جلد ۵۱، شمارہ ۱۲ (دسمبر ۱۹۸۱ء) ص ۴۱، موصوف کا خیال ہے کہ لفظ کروبی لاطینی لفظ CHERUB سے ماخوذ ہے، جس کا تلفظ "کیروب" ہے لیکن اکثر انگریزی داں لوگ اس کا تلفظ "چیرب" کرتے ہیں۔ اول یہ کہ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، اسلامی ادبیات میں یہ لفظ براہ راست عبرانی زبان سے وارد ہوا، اور دوسرے یہ کہ CHERUB کا زیادہ مستند و متداول تلفظ وہی ہے جو اکثر انگریزی داں لوگ کرتے ہیں، اور اس کی تائید انگریزی زبان کی درج ذیل دو[2] عظیم فرہنگوں سے بھی ہوتی ہے:

i) THE OXFORD ENGLISH DICTIONARY, op. cit., 325;
ii) WEBSTER'S THIRD NEW INTERNATIONAL DICTIONARY SPRINGFIELD MASSACHUSETTS, 1961, 385

مؤخر الذکر نے "کیرب" لفظ بھی ضبط کیا ہے، لیکن محض متبادل کے طور پر عام فرہنگوں میں یہ متبادل درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔

خواجہ میر درد | دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو — ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں[1]

میرزا محمد رفیع سودا | آہ و نالے سے مرے ساتوں فلک سے تا عرش — رہتے ہیں پنبہ بگوش اب روز و شب کرّوبیاں[2]

بدقسمتی سے فارسی کی طرح اردو امثلہ و نظایر سے بھی لفظ کروبیان کے خد و خال خاطر خواہ طریقے سے واضح نہیں ہوتے اور نہ ہی متداول فرہنگیں اس سلسلے میں قاری کی پوری طرح پیاس بجھاتی ہیں، مثال کے طور پر برہان قاطع[3] میں کروبیاں کی تشریح یوں کی گئی ہے:

"فرشتگانِ مقرب را گویند، وایشاں را د عالم اجسام ہیچ تعلق و تدبیر و تصرفے نیست۔"

کم و بیش ایسی ہی توضیحات دوسری کتبِ لغت[4] میں ملتی ہیں، بعض مآخذ کی رو سے لفظ کرّوبیوں (ع جلد جمع کرّوبی) کا اطلاق فرشتگانِ چہار گانہ جبرائیل و میکائیل اسرافیل و عزرائیل پر ہوتا ہے۔[5] بعض اسرائیلی روایات میں کرّوبیوں کو مختلف صفاتِ خداوندی کی مجسم صورت سے تعبیر کیا گیا ہے، اور علم کو ان کی امتیازی خصوصیت گردانا گیا ہے۔[6] زمانۂ ماقبل مسیحیت میں لفظ معانی و تعبیرات کے اعتبار سے جن مختلف مراحل سے گذرا ان میں ایک بات بہر حال مشترک ہے، اور وہ یہ ہے کہ کرّوبیوں کا ذات ایزد تعالیٰ سے نزدیکی ارتباط

---

[1] بہ نقل از ڈاکٹر ریاض الحسن، ص ۴۱ [2] ایضاً کلیات سودا، الہ آباد ۱۹۷۱ء حصۂ دوم، ص ۲۱۔

[3] تالیف محمد حسین بن خلف تبریزی متخلص بہ برہان، بہ اہتمام دکتر محمد معین، تہران، ۱۳۴۲ شمسی چاپ دوم، جلد سوم ص ۱۶۲۹۔ [4] مثلاً ملاحظہ ہو: فرہنگ آنند راج، تالیف محمد پادشاہ متخلص بہ شاد، زیر نظر محمد دبیر سیاقی، تہران، جلد پنجم، ص ۳۳۹۹۔

[5] THOMAS PATRICK HUGHES, op. cit. ii; CF. THE ENCYCLOPEDIA AMERCANA op. cit. P. 420

[6] THE ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION AND ETHICS, op. cit., p 510.

پہلے پہل ان کو ذات باری تعالیٰ کے ایسے ممتاز پیشکار کا درجہ دیا گیا جن کی وساطت سے اللہ تعالیٰ انسانوں سے رابطہ قائم کرنے اور کائنات میں مختلف امور کی انجام دہی کا کام لیتا تھا، لیکن بعد میں انہیں محض مقربین ایزدی مانا جانے لگا، پھر ایک ایسا دور بھی آیا جب لوگوں نے عام فرشتوں اور کروبیوں میں تفاوت کرنا ترک کر دیا، جب فکر، اندیشے، اور اعتقاد کی یہ کیفیت بھی دوام نہ پیدا کر سکی تو کروبیوں کو تو بارگاہِ ربانی میں حضورِ دوام کی خصوصیت سونپ دی گئی (جس کی صدائے بازگشت برہان قاطع کی مندرجۂ بالا تعریف میں سنائی دیتی ہے) اور فرشتوں سے مراد وہ مخلوق لی جانے لگی جس کے ذمہ اللہ تعالیٰ کے لیے پیغام رسانی اور اس کے دیگر احکام کی بجا آوری تھا۔[1]

CHERUB اور CHRUBIM کے الفاظ انجیل مقدس میں کئی بار استعمال ہوئے ہیں، لیکن ان سے اس مخلوق کی کوئی مشخص اور دقیق تعریف یا تصویر قاری کے سامنے نہیں آتی،[2] تاہم چوتھی صدی عیسوی کے راہب دیوجانس[3] سے باشتباہ منسوب ایک ملکوتی نظام مراتب میں کروبیوں کو جن کی نمایاں خصوصیت ان کی علمیت ہے، SERAPHIM کے بعد، جن کا طرۂ امتیاز عشقِ خداوندی ہے، مقرب ترین ملائکہ قرار دیا ہے۔[4]

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عربی، فارسی، اردو (اور غالباً دوسرے اسلامی ادب) پر اسرائیلیات کا اثر مسیحی روایات سے زیادہ مستحکم ثابت ہوا، اور اس کا بدیہی نتیجہ یہ نکلا کہ کروبیوں کو ذات بحتہ کے مقرب ترین

---

[1] The Encyclopaedia of Religion and Ethics Op. cit., P 513

[2] ENCYCLOPAEDIA BRITANNICA, LONDON, 1961, p. 419

[3] DIONYSIUS THE AREODAGITE

[4] ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION AND ETHICS op. cit., p. 513

ملائکہ ہی سے تعبیر کیا جاتا رہا۔

یہاں شاید اس امر کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ انگریزی ادب میں کروبی یا کروبیوں کے الفاظ مجازی طور پر انتہائی معصوم بچوں، غیر معمولی طور پر خوبصورت خواتین، اور حد درجہ کی ذہین اور نابغہ شخصیات کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں[1]. اور شکسپیر نے تو ان کا اطلاق بعض اخلاقی اوصاف پر بھی کیا ہے[2]، ہمارے یہاں کم از کم فارسی اور اردو ادب میں ایسے موارد میں کروبی کے بجائے فرشتہ کا لفظ زیادہ مستعمل ہے، اور فرشتہ تن، فرشتہ خصال، فرشتہ خو، فرشتہ رخ، فرشتہ سرشت، فرشتہ سیرت، فرشتہ لقا، فرشتہ منش، فرشتہ نما، فرشتہ نہاد اور فرشتہ وش ایسی بے شمار تراکیب اس کا منھ بولتا ثبوت ہیں، کروبی کا اس طرح کا استعمال اول تو ہے نہیں، اگر کہیں نظر بھی آجائے تو اس کی حیثیت اصول سے زیادہ استثنا رکی ہوتی ہے۔

---

[1] THE OXFORD ENGLISH DICTIONARY, op. cit. p. 326

[2] PATIENCE, THOU YOUNG AND ROSE-LIPP'd CHERUBIN
OTHELLO, ACT IV, Sc. 2, 1. 63

معرکہ مکین وسودا

از

جناب ڈاکٹر حامد افاق قریشی صاحب، مہانگر لکھنؤ

اودھ کے چوتھے نواب آصف الدولہ کی نوابی کے دور میں لکھنؤ میں مرزا فاخر مکین اور مرزا رفیع سودا کی چشمک کا واقعہ کافی مشہور ہے لیکن افسوس ہر کسی نے بھی نہ تو اس واقعہ کی صحیح تفصیلات ہی لکھی ہیں اور نہ اس کی تاریخ متعین کرنے کی زحمت گوارا کی ہے، اودھ کی تاریخ پر تحقیقی کام کرنے کے دوران کچھ ایسا مواد مل گیا ہے جس کی مدد سے اس چشمک کی تفصیلات بھی فراہم ہو گئی ہیں، اور اس کی تاریخ بھی متعین ہو گئی ہے؛

اوس ذکر کو سن من و عن اب میری زبانی   کھینچوں ہیں اس احوال کی تقریر میں تصویر

اودھ کے نوابی دور میں اشرف علی خاں فغاں نام کے ایک با اخلاق و مہذب بزرگ تھے جن کا تعلق شرفا کے ایک عمدہ گھرانے سے تھا، ان کو نوجوانی سے ہی شعر و شاعری کا شوق تھا اور پیری تک رہا، انھوں نے پندرہ ۱۵ برس کی محنت شاقہ کے بعد مختلف تذکروں اور دواوین سے انتخاب کر کے تقریباً ایک لاکھ اشعار پر مشتمل ایک تذکرہ لکھا،

ان دنوں مکین کی فارسی دانی کی شہرت تھی، اشرف علی کو اپنے انتخاب سے اطمینان نہ تھا، اس لئے وہ اپنے تذکرہ کو مکین کے پاس اصلاح کے لئے لے گئے، الحاح و سماجت کے بعد مکین اس شرط پر اس تذکرہ کی تصحیح کرنے کے لئے تیار ہوئے کہ تمام شعرائے ہند مثلاً فیضی، غنی، نسبتی

ناصر علی، بیدل، سراج الدین علی خاں آرزو اور میر شمس الدین فقیر وغیرہم کے جو بھی اشعار اس تذکرہ میں ملیں گے انھیں وہ قلم زد کر دیں گے اور شعرائے اہل ولایت کے انتخاب اشعار کی تصحیح بھی کرتے جائیں گے، یہ سن کر اشرف علی اس تذکرہ کو اُن کے پاس سے لے آئے، اور اس کی تصحیح کرانے سے باز آئے۔

چند سال کے بعد اشرف علی اس تذکرہ کے تین جز شیخ آیت اللہ ثنا کے پاس تصحیح کے لئے لے گئے، انھوں نے کچھ حصہ کو دیکھ کر اس کی تصحیح کر دی لیکن کچھ عرصہ کے بعد انھیں لکھنؤ سے فیض آباد جانا پڑا، اور اس کے بعد کچھ نامعلوم اسباب کی بنا پر وہ اس کام کو انجام نہ دے سکے،

اشرف علی ایک بار پھر اس تذکرہ کو لے کر مکین کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اس کی تصحیح کرنے کے لئے گذارش کی،

اس تذکرہ کو لے گئے القصہ وہ اس پاس — تا دیکھے وہ اس تذکرہ کے شعر تباخیر
جو شعر ہو جیسا اس میں کریں صاد وہ اس پہ — اور سُست کے احوال کو دیویں وہ تغیر

مکین نے ان اجزا کو جن کو شیخ آیت اللہ نے تصحیح کیا تھا، دیکھنے کے بعد کہا کہ وہ اس تذکرہ کی تصحیح اُس وقت کریں گے جب وہ اُس کے لئے ایک تحریر لکھ کر دیں، اشرف علی نے ایک تحریر لکھکر اُن کی خدمت میں پیش کی لیکن اس کو دیکھ کر انھوں نے برہمی کا اظہار کرتے ہوئے اسے پھینک دیا، اور کہا کہ جس قسم کی تحریر وہ کہیں. آپ اسی قسم کی دیں، اشرف علی خاں اس کے لئے بھی تیار ہو گئے،

اس کے بعد مکین نے اشرف علی سے کہا کہ اس نوشتہ میں یہ لکھو کہ میں اس تذکرہ کو پہلے مرزا فاخر سلمہ کی خدمت میں برائے تصحیح اشعار و عبارت لے گیا تھا لیکن موصوف بسبب کثرت اشغال اس کے لئے فرصت نہ نکال سکے، اس لئے اس کے تین جز کو شیخ آیت اللہ ثنا کے پاس جن پر مجھے اس فن کے استاد ہونے کا گمان تھا، لے گیا، انھوں نے کچھ مقامات کو جو کہ غلط تھے،

صحیح جانا کہ ان سے درگزر کیا۔ اور بعض مقامات کو غلط سمجھ کر ان کی تصحیح کر کے بالکل مسخ کر دیا، لہٰذا دوسری بار تمام آرزو کے ساتھ میں نے اس کو مرزا فاخر مکین صاحب کی خدمت میں تصحیح کے لئے پیش کیا، جو کہ اس فن کے استاد ہیں۔ بلکہ ان کی مثل اس خطہ، زمانہ یا اس شہر میں کوئی دوسرا صاحبِ کمال نہیں ہے،

استاد مکین کے اس مضمون کو سن کر اشرف علی نے دل میں تو بڑا پیچ و تاب کھایا لیکن مرتا کیا نہ کرتا، صرف اتنا کہا کہ اس تحریر میں شیخ آیت اللہ کا ذکر کرنا مناسب نہیں ہے، کیونکہ وہ اس بندہ کے آشنا ہی نہیں بلکہ مسلم الثبوت استاد بھی ہیں، لیکن مکین پر ان کی اس بات کا کوئی اثر نہ ہوا، اور وہ اسی تحریر کے لکھنے پر مصر رہے، عاجز ہو کر اشرف علی کو مکین کے بتائے ہوئے مضمون پر ہی اپنی مہر ثبت کرنی پڑی،

تذکرہ مشاہیر کے حالات اور کارناموں سے مزین تھا، لیکن پھر بھی اس کی تصحیح کرنے میں مکین نے جو جارحانہ انداز اپنایا، وہ ذیل کے اشعار سے عیاں ہے،

اصلاح کی لکھوا سند اشرف علی خاں سے — وہ تکیے مسند تعلیم جا بہ سیر
اس طرح ہوا تذکرہ او پر متوجہ — کرتی ہے زباں جس کے بیاں کرنے میں تاخیر
تن پر نہ رکھا ایک کے سر ان میں سے اس نے — لی ہاتھ جو ظالم نے قلم اپنے کی شمشیر
آئے وہ سب اس طرح زیرِ قلم اس کے — جوں فوج گنہگاروں کی آئے تہِ شمشیر

اشرف علی کو اس کی خبر ہوئی تو ان کی حالت غیر ہو گئی، وہ اسی سراسیمگی کے عالم میں کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح مکین کے پاس پہونچے، اور کافی گرما گرمی کے بعد وہ اس تذکرہ کو اپنے گھر لے آئے،

گھر لا کر جب اشرف علی نے تصحیح شدہ تذکرہ دیکھا تو وہ اور زیادہ رنجیدہ ہوئے، انھوں نے

گوشہ نشینی اختیار کرلی اور ان اشعار کو جن کو مکین نے قلم زد کردیا تھا، صاف کرنے میں رات دن مشغول رہنے لگے، کچھ دن اسی طرح بیت گئے، ایک دن وہ مکین کے اس تصحیح کردہ تذکرہ کو لیکر مرزا رفیع سوؔدا کی خدمت میں حاضر ہوئے، جن سے ان دیرینہ شناسائی تھی، اور انصاف کے طالب ہوئے،

اشرف علی کا مدعا سن کر سوؔدا نے اُن سے کہا کہ انھیں فارسی زبان سے زیادہ ربط نہیں، وہ تو اردو میں قصیدہ اور غزل تھوڑا بہت کہہ لیتے ہیں، جس کو لوگوں کی قدر دانی کے سبب سے قبولیت کا درجہ حاصل ہوگیا ہے، مرزا فاخر صاحب کے کمالات میں کوئی شک نہیں ہے، انھوں نے جو کچھ کہا ہے، سوچ سمجھ کر، اور سنجیدگی ہی سے کہا ہوگا، اگر آپ کو انصاف ہی طلب کرنا ہے تو فارسی کے سخنورانِ فن کے پاس جائیں، اس دور میں شیخ محمد علی حزیںؔ کے شاگرد شیخ آیت اللہ ثناؔ اور میر شمس الدین فقیرؔ کے شاگرد مرزا بچھو ذرہ موجود ہیں، اُن کے علاوہ مرزا ابو علی ہاتفؔ بنگال، نظام الدین بلگرامی صانعؔ فرخ آباد، اور شاہ نور العین واقفؔ شاہ جہان آباد میں موجود ہیں، آپ اُن لوگوں کے پاس جائیں، اور اس بندہ کو معاف کریں،

انصاف طلب ہو جسے اُن اشخاص سے جا کر — جو فارسی گوئی میں ہیں بالفعل مشاہیر
میں ریختہ گو ہوں مجھے اب رکھئے معاف آپ — دکھلایئے اس کو انھیں اچھی ہے یہ تدبیر

یہ جواب سُن کر اشرف علی نے سودا سے کہا کہ ان نامور فارسی دانوں کو تو مکین خاطر میں بھی نہیں لاتے، ان کا کہنا ہے کہ شمس الدین فقیرؔ نے اپنے رسالہ عروض میں پانچ چھ جگہ فاش غلطیاں کی ہیں، انھیں شیخ آیت اللہ ثنا کے اشعار پر اعتراض ہے، اور نور العین واقفؔ کے متعدد اشعار میں بھی انھوں نے تصحیح کی ہے،

اشرف علی کا جواب سن کر سودا نے بدرشتی کہا کہ صاحب جب مرزا مکین کو کسی کا اعتبار

ہی نہیں ہے تو آپ اس بندہ سے کیا انصاف طلب کر رہے ہیں، بندہ کو تو ان لوگوں کے مقابلہ میں دانائی سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے،

سودا کا یہ جواب سن کر اشرف علی اور زیادہ رنجیدہ و آزردہ ہوگئے، اور جبراً و قہراً اس تذکرہ کو اُن کے یہاں چھوڑ کر اپنے گھر چلے گئے،

اس کے بعد سودا نے اس تذکرہ کو وقتاً فوقتاً دیکھنا شروع کیا، اور جب وہ ان مقامات کی طرف متوجہ ہوئے جہاں مکین نے اپنی تیغ اصلاح چلائی تھی، تو اُن کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی،

سودا ہوا اُس دم گلِ تصویر سا حیران — یوں دیکھی جب اسکی وہ چنبندیِ تحریر

اصلاح کے نام پر مکین نے اس تذکرہ میں عجب ستم ظریفیاں کی تھیں، اور فصیح و بلیغ کلام میں قطع و برید کرکے طرح طرح کے گل کھلائے تھے، کسی مصرع کو کاٹ دیا تھا اور کسی میں اصلاح کردی تھی، بہت سے اشعار اور الفاظ کو بے معنیٰ کہکر تضحیک کی تھی، کہیں معنی سے گذر کر رعایتِ لفظی سے کام لیا تھا اور کہیں الفاظ و معانی کو تبدیل کردیا تھا، کہیں بے معنیٰ و ناموزوں کہکر صفحات کے صفحات اشعار کو قلم زد کردیا تھا، ستم یہ کہ یہ سلوک کسی ایک دو احد شاعر کے ساتھ نہ تھا، بلکہ متقدمین، متوسطین اور متاخرین ہر دور کے شعرائے کرام پر مکین نے اسی طرح کی گرفت کی تھی، اور حالت یہ تھی کہ

اس تذکرہ پر ہاتھ وہ اس طرح کیا صاف — جس طرح سے جو زنگ لگاتے ہیں پہ شمشیر

ان سب میں دو باتیں سودا کو سب سے زیادہ کھٹکیں، ایک تو یہ کہ مکین نے استادانِ مسلّم الثبوت کے کلام کو قلم زد کردیا تھا، اور دوسرے یہ کہ انھوں نے ان لوگوں کو جو کہ اس دنیا میں کوچ کر گئے تھے، اچھے الفاظ میں یاد نہیں کیا تھا،

اس کے بعد سوداؔ نے مکین کے دیوان کو جوان کے پاس ایک صاحب توقیر لے گئے تھے بغور دیکھا، تو اس میں متعدد الفاظ و معانی گرہ گیر تھے،

سودا نے مکین کی بے جا خامہ فرسائی اور ان کے کلام کے ستم کو واضح کرنے کے لئے ایک علمی رسالہ لکھا، جس کا نام انھوں نے "عبرۃ الغافلین" رکھا،

کی اس نے رسالہ کی غرض پانچ ہیں فصلیں پہلے میں تو لکھنے کے رسالہ کی ہے تقریر
اور دوسری وہ فصل کہ جس میں ہیں وہ اشعار جو اس کے قلم کے تھے ہوئے طعمۂ شمشیر
اور تیسری وہ فصل کہ اصلاح کر اُس نے استادوں کے اشعار کئے ہیں زبر و زیر
اور فصل چہارم میں وہ اشعار مکینؔ کے کس لطف سے تقریر کو لایا ہے یہ تحریر
پنجم میں وہ اشعار ہیں کہ کر اصلاح سودا نے جن اشعار کے دی معنی کو توقیر

جب مندرجۂ بالا رسالہ تیار ہو گیا اور اس کی شہرت ہوئی، تو مکینؔ بہت گھبرائے، اور اپنے ان اشعار کی اسناد دے کر جن پر سوداؔ نے گرفت کی تھی، اپنے شاگرد بقاؔ اللہ خاں بقاؔ کو سودا کے پاس مناظرہ کے لئے بھیجا، ان میں کئی دن تک باہم تکرار رہی، اور آخر کار تان یہاں آکر ٹوٹی،

مکین کا ایک شعر تھا،

گرفتہ بود دریں بزم چوں قدح دل من شگفتہ روے صبا شگفتہ کرد مرا

اس پر سوداؔ کا یہ اعتراض تھا،

سوداؔ کی یہ اس شعر پہ حجت تھی کہ تو نے کس واسطے باندھا ہے قدح کے تئیں دلگیر
دے گئے ہیں قدح کو وہ گل ولالہ سے تشبیہ جو ڈال گئے شعر کی بنیاد کی تعمیر
ہے شکل گل ولالہ شگفتہ کی گرفتہ ہے یہ وہ وہی منکر اس ڈھنگ سے تقریر
صورت گل ولالہ کی اگر ہوتی گرفتہ کب کرتی پیالہ کی تشابہ سے وہ تدبیر

اس کے جواب میں مکین نے بقاؔ کو باذلؔ کا یہ شعر لکھ کر دیا،

چو ننشا طِ بادہ بخشد بمن خراب بے تو بدل گرفتہ مانند قدحِ شراب بے تو

اور کہا کہ اس سند کو دکھا کر تم سوداؔ کو زیر کرنا اور پھر یہ تقریر کرنا،

ہے ستم بھی شعر میں اس طرح ہمارے ہے ان کے سمجھنے میں ترے فہم کی تقصیر

یہ جواب سن کر سوداؔ نے بقاؔ سے کہا کہ اے فہم کے دشمن پہلے اس شعر کے معنی سمجھ اور پھر اس کو تذکیر میں لا کیونکہ یہ شعر تو میرے اعتراض کی تائید کرتا ہے نہ کہ رد،

جب یہ شعر بھی مکینؔ کے شعر کی سند نہ ٹھہر سکا تو بقاؔ دلگیر ہو کر وہاں سے اٹھے اور اپنی شکست کا حال جا کر مکینؔ کو سنایا،

سخن کے میدان میں شکست خوردہ ہونے پر مکینؔ نے اپنی خفت مٹانے کے لئے اپنے تمام شاگردوں کو، جن میں شیخ زادگان لکھنؤ کی تعداد زیادہ تھی، جمع کیا، اور کہا کہ تم سوداؔ کے گھر جاؤ، اس کی تذلیل کرو۔ اور اس کو مجھ سے بحث کرنے کے لئے یہاں پکڑ کر لاؤ،

مکین کا اشارہ پاتے ہی اس کے تمام شاگرد خنجروں اور شمشیروں سے لیس ہو کر سوداؔ کے گھر جا دھمکے، سوداؔ نے بتعظیم و اخلاق ان کا خیر مقدم کیا، ان لوگوں نے بیٹھتے ہی سوداؔ سے کہا کہ آپ کو مکینؔ نے بلایا ہے، اس لئے چلنے میں تاخیر نہ کریں، انھوں نے خفقان کا عذر کیا اور کہا کہ میں مکین کے یہاں کل حاضر ہو جاؤں گا،

سوداؔ کا جواب سنتے ہی ایک شخص نے ان کی کوکھ پر چھری رکھدی، اور دو برہنہ شمشیریں لے کر ان کے سر پر کھڑے ہو گئے، اور کہا کہ ہم لوگ آپ کو اسی وقت مکینؔ کے پاس لے چلیں گے، اس لیے دیر نہ کریں، اور اس رسالہ کو بھی ساتھ لے لیں، جو آپ نے لکھا ہے، ان کا یہ رنگ دیکھ کر سوداؔ کو ان کے ساتھ جانے ہی میں اپنی عافیت نظر آئی اور وہ اپنے میانہ کو منگوا کر اس میں

سوار ہوگئے، اس حالت میں بھی ایک شخص چھری لے کر ان کے ساتھ میانہ میں سوار ہوگیا،

ابھی وہ لوگ سودا کے گھر سے دس قدم ہی چلے ہوں گے کہ آصف الدولہ کے چھوٹے بھائی سعادت علی خاں کی سواری فوج وحشم کے ساتھ ادھر سے گذری، انھوں نے سودا کو ایک میانہ میں سوار اور ان کے اردگرد ایک جم غفیر دیکھ کر ان سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ اس معاملہ کا حال سن کر انھوں نے سودا کو بتوقیر اپنی خواصی میں جگہ دی، اور ان شر پسند عناصر کی گرفتاری کا حکم صادر کر دیا، لیکن وہ سب کے سب وہاں سے رفو چکر ہوگئے،

ماروں سے خبردار ہوں جاتے رہو وہ یوں
جس طرح کمان سخت میں سے جائے نکل تیر
آشکر حصہ نے تو یہ دی دوران کو ہزیمت
یوں آگے کا احوال کیا خامہ نے تحریر

اس کے بعد سعادت علی خاں سودا کو اپنے گھر لے گئے، اور فرمایا کہ میں اس عہد کا حاکم نہیں ہوں، اس لئے مجبور ہوں، ورنہ تم دیکھتے کہ میں ان کی کیسی تعزیر کرتا، ان شرارت پسندوں سے ان کو محفوظ رکھنے کے لئے سعادت علی خاں نے سودا کو کچھ دن اپنے مکان میں رہنے کی بھی پیش کش کی،

سودا نے سعادت علی خاں کی کرم فرمائی کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا، اور کہا کہ مجھے مکین سے کوئی عداوت نہیں، بلکہ محض سخن کی تکرار تھی، شاعروں کے لئے جنگ سخن کرنے کے لئے تیغ زبان سے بڑھ کر کوئی اور شمشیر نہیں ہوتی، مکین کی تیغ سخن اصالت نہیں رکھتی، اس لئے انھوں نے شمشیر سے لڑنے کی تدبیر کی، لیکن ظاہر ہے کہ یہ سب ان کے حمق ہی کی تقصیر ہے، میں مسلم الثبوت استادوں کی وہ تحقیر گوارا نہ کرسکا، جو مکین نے اشرف علی کے تذکرہ کی تصحیح کرنے میں کی تھی، اس لئے میں نے وہ رسالہ لکھا تھا، اور مکین کے اشعار پر بھی بیجا گرفت کی تھی، یہ سب کچھ عرض کر کے سودا سعادت علی خاں سے رخصت ہو کر اسی شب اپنے گھر

واپس لوٹ آئے،

جب نواب آصف الدولہ کو اس کی خبر پہنچی تو وہ آگ بگولا ہوگئے،

یہ شعلہ در آتش خشم و قہر کے اس کے
اس لحظہ تھی قاصر ہے بیاں جسکی میں تقریر
بجھتی نہ تھی آتش غضب و غصہ کے اس کے
ہر چند کہ ارکاں تھے بجھانے کی بتدبیر

اور اپنے نائب مختار الدولہ کو بلا کر حکم دیا کہ مکین کو فوراً جلا وطن کر دو، اور شیخ زادگان لکھنؤ کے محلہ کو کھدوا کر پھنکوا دو، اور ان کے بچوں بوڑھوں کو گنگا پار بھجوا دو،

لاؤ میرے احکام کو تم جلد عمل میں
خاصہ میں نہ کھاؤں گا اگر اسمیں ہوئی دیر

نواب صاحب کے اس حکم کو سن کر مختار الدولہ حیران و ششدر رہ گئے، ان دنوں وہ شیخ زادگان لکھنؤ کی سرداری کر رہے تھے، اور وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہتے تھے، اس لئے انھوں نے اپنے اہلکاروں کو طلب کر کے حکم دیا کہ شیخ زادگان لکھنؤ اور مکین کو فوراً سودا کے پاس لیجاؤ اور یہ کہو

حاضر ہوئے ہیں آج گنہگار تمھارے
جس طرح انھیں چاہئے اب دیجئے تعزیر

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، اور وہ لوگ اس عالم میں سودا کے سامنے حاضر ہوئے کہ

سودا کنے جس وقت کہ ان کے تئیں لائے
خجلت سے ہر اک ان میں تھا غرق خوی تشویر
خفت سے انھوں کے تھا جو کچھ چہروں کا عالم
احوال وہ زنہار نہیں قابل تحریر

ان کا یہ عالم دیکھ کر سودا نے ان کا قصور معاف کر دیا، اور عطر و پان دے کر رخصت کیا، آصف الدولہ کے ہرکارے وہاں موجود تھے، انھوں نے تمام تفصیلات نواب صاحب کے گوش گذار کر دیں، اور اس طرح یہ معرکہ بخیر و عافیت اختتام پذیر ہوا،

معرکہ مکین و سودا کی مندرجۂ بالا تفصیلات معاصر ماخذوں "عبرت الغافلین" تصنیف کے

از تلامذۂ ارشد مرزا رفیع المتخلص بسودا مع قصیدہ نہ صد و پنجاہ شعر سے اخذ کی گئی ہیں، اس زمانہ کے سیاسی حالات سے بھی ان تفصیلات کی مزید تائید ہوتی ہے،

اودھ کے تیسرے نواب شجاع الدولہ نے ۱۷۷۴ء میں روہیلکھنڈ فتح کیا اور سعادت علی خاں کو اس علاقہ کا برائے نام گورنر بنایا، بعض ماخذوں میں ہے کہ شجاع الدولہ نے سعادت علی خاں کو اس علاقہ کا گورنر اس لئے بنایا تھا کہ وہ اُن کے بعد اس علاقہ کے مطلق العنان حکمراں بنیں گے، لیکن یہ بات پایۂ تحقیق کو نہیں پہونچتی، کیونکہ اپنی وفات سے قبل انھوں نے جو خط گورنر جنرل کو لکھا تھا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ آصف الدولہ کو اودھ کے تمام علاقوں کا واحد حکمراں بنانا چاہتے تھے،

شجاع الدولہ کی وفات ۲۶ جنوری ۱۷۷۵ء کو ہوئی، اور اُن کے بعد ان کے سب سے بڑے بیٹے آصف الدولہ اودھ کے چوتھے نواب بنے، انھوں نے نواب بنتے ہی سعادت علی خاں کو اپنے پاس بلانے کے لئے ایک شقہ روانہ کیا، سعادت علی خاں اس حکم کو بالائے طاق رکھ کر اس علاقہ میں اپنی خود مختار ریاست قائم کرنا چاہتے تھے، اور کچھ فوجی افسر پہلے اس کے لئے تیار بھی ہو گئے، لیکن جب آصف الدولہ کی ماں بہو بیگم نے جو ان دنوں اودھ کی حکومت میں کافی اثر رکھتی تھیں، فوجی افسروں کو یہ حکم روانہ کیا کہ وہ آصف الدولہ کے وفادار رہیں، تو انھوں نے سعادت علی خاں کی مدد کرنے سے انکار کر دیا، سعادت علی خاں نے یہ بھی دیکھا کہ انگریز آصف الدولہ کی مسند نشینی کی حمایت کر رہے تھے، اس لئے مجبور ہو کر انھوں نے بریلی سے لکھنؤ کے لئے کوچ کیا، اس بیچ آصف الدولہ لکھنؤ کو اپنا دار الحکومت بنانے کے لئے فروری ۱۷۷۵ء میں فیض آباد سے روانہ ہو چکے تھے، اور راستہ میں سعادت علی خاں ان سے آ کر مل گئے، آصف الدولہ نے ان کے اخراجات کے لئے ۳ لاکھ روپیہ سالانہ کی ایک جاگیر مقرر کر دی۔ لیکن سعادت علی

خاں اس سے خوش نہ تھے، کیونکہ یہ جاگیر ان کے اخراجات کے لئے ناکافی تھی، اور اُن کی مرضی کے خلاف زبردستی اُن پر تھوپ دی گئی تھی، سعادت علی خاں آصف الدولہ کے بعد شجاع الدولہ کے سب سے بڑے بیٹے تھے، اس لئے ان کا خیال تھا کہ اُن کو دوسرے بھائیوں کے مقابلہ میں اودھ کے دربار میں زیادہ عزت اور وقار ملنا چاہئے، لیکن آصف الدولہ اُن سب کے ساتھ مساوی برتاؤ کرتے تھے، اور اپنے دیگر بھائیوں کی طرح ان کو بھی سواری کے لئے محض دو ہاتھی ہی دئیے تھے، آصف الدولہ کے نائب مختار الدولہ کا رویہ بھی ان کے ساتھ اچھا نہ تھا، اور وہ اُن کو ان کے مرتبہ کے مطابق خاطر میں نہ لاتے تھے، ان سب باتوں سے ظاہر ہے کہ آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کے تعلقات ان دنوں اچھے نہ تھے، اور یہی وجہ ہے کہ سودا کو ان موذیوں سے چھڑانے کے بعد سعادت علی خاں محض اُن کو اپنے گھر لے جانے، اور ان کی تسلی و تشفی کرنے کے علاوہ کچھ اور نہ کر سکے،

مسند نشینی کے بعد آصف الدولہ اپنا تمام تر وقت لہو و لعب میں گزارتے تھے، اور حکومت کے معاملات سے اُن کو کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، اگر کوئی آدمی اُن کے پاس فریاد لیجاتا تھا تو وہ کہتے کہ مختار الدولہ کے پاس جاؤ، مجھے ان معاملات سے کوئی سروکار نہیں ہے، مختار الدولہ نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا، انھوں نے حکومت کے تمام محکموں میں اپنے دوستوں، بھائیوں، رشتہ داروں اور اپنی پسند کے امیروں کو لا بٹھایا، شجاع الدولہ کے دور کے بہت سے امیروں کو برطرف کر دیا، اور جو باقی رہے ان کو ستانے لگے، ان حالات میں اودھ کے یہ امراء ان کے جانی دشمن بن گئے، اور ان کے زوال کی فکر میں لگ گئے، ان امیروں کے خلاف ایک گروہ کھڑا کرنے کے لئے مختار الدولہ ان دنوں شیخ زادگانِ لکھنؤ کی سرداری کر رہے تھے، جو بلا کے جنگجو تھے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے ان وفادار حامیوں کو بچانے کے لئے معرکۂ مکین

وسودا کو خوشگوار طریقہ سے ختم کرانے میں اتنی دلچسپی کا اظہار کیا،

شیخ چاند نے لکھا ہے کہ "اس معرکہ کا حال سودا کے رسالہ "عبرت الغافلین" اور ان کے شاگرد اصلح الدین کے اس قصیدے میں معلوم ہوگا، جو مصحفی کی ہجو میں تحریر ہوا ہے، آزاد دہلوی نے رسالۂ مذکور اور اس قصیدے کا خلاصہ آب حیات میں درج کیا ہے، جو یہاں بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے،"[۵۱] شاید شیخ چاند نے نہ تو عبرت الغافلین بغور پڑھی تھی، نہ اصلح الدین ہی کے قصیدہ کو، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس واقعہ کو آب حیات سے بجنسہٖ نقل کرنے کے بجائے اس کا متن وہ کچھ اس طرح سے پیش کرتے، جیسا کہ اس مضمون میں کیا گیا ہے، مکین نے اشرف علی کے تذکرہ کی تصحیح کرنے میں قطع برید کے جو گل کھلائے تھے، ان کا حال تو آپ پڑھ چکے ہیں لیکن محمد حسین آزاد نے اس واقعہ کو عبرت الغافلین اور اصلح الدین کے قصیدے سے اپنے لفظوں میں منتقل کرنے میں ان سے بھی بازی لے گئے ہیں، اور ایک بار پھر یہ ثابت کر دیا ہے، کہ انھیں مضامین کے گل پھول اور باتوں کے طوطا مینا بنانے بہت آتے تھے،[۵۲] اس معرکہ کی اصل تفصیلات مدنظر رکھتے ہوئے اب آزاد کا یہ بیان پڑھئے، اور اس بیان میں جو باتیں صحیح ہیں، ان کو ( ) میں بند کر دیا گیا ہے،

"بچارے نے جزدان غلام کو دیا، (خود میانے میں بیٹھے، اور اُن کے ساتھ ہوئیے، گروہ لشکر شیطان تھا، یہ بیچ میں تھے،) چوک میں پہنچے تو انھوں نے چاہا کہ یہاں انھیں بے عزت کیجئے، کچھ تکرار کر کے پھر جھگڑنے لگے (مگر جسے خدا عزت دے، اسے کون بے عزت کر سکتا ہے؛ اتفاقاً سعادت علی خاں کی سواری آ نکلی مجمع دیکھ کر ٹھہر گئے، اور حال دریافت کر کے سودا کو اپنے ساتھ ہاتھی پر بٹھا کر لے گئے،) آصف الدولہ حرم سرا میں دستر خوان پر تھے، سعادت علی خاں اندر گئے، اور کہا کہ بھائی صاحب بڑا غضب ہے، آپ کی

اور شہر میں یہ قیامت! آصف الدولہ نے کہا کیوں بھئی خیر باشد، انھوں نے کہا کہ مرزا رفیع جس کو باوا جان نے برادر من اور مشفق مہربان کہہ کر خط لکھا، آرزوئیں کر کے بلایا، اور وہ نہ آیا، آج وہ یہاں موجود ہے، اور اس حال میں ہے کہ اگر اس وقت میں نہ پہنچتا تو شہر کے بدمعاشوں نے اس بچارے کو بے حرمت کر ڈالا تھا، پھر سارا ماجرا بیان کیا، آصف الدولہ فرشتہ خصال گھبرا کر بولے کہ بھئی مرزا فاخر نے ایسا کیا تو مرزا کو کیا، گویا ہم کو بے عزت کیا، باوا جان نے ان کو بھائی لکھا تو وہ ہمارے چچا ہوئے، سعادت علی خاں نے کہا کہ اس میں کیا شبہہ ہے، اسی وقت باہر نکل آئے، سارا حال سنا، بہت غصہ ہوئے، اور حکم دیا کہ (شیخ زادگان کا محلہ اکھڑوا کر پھینک دو، اور شہر سے نکلوا دو) مرزا فاخر کو جس حال میں ہو اسی حال سے حاضر کرو، سودا کی نیک نیتی دیکھنی چاہئے، ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ جناب عالی ہم لوگوں کی لڑائی کاغذ قلم کے میدان میں آپ ہی فیصل ہو جاتی ہے، حضور اس میں مدا نہ فرمائیں، خادم کی بدنامی ہے، جتنی مدد حضور کے اقبال سے پہنچی وہی کافی ہے؛ غرض مرزا رفیع سودا باعزاز واکرام وہاں سے رخصت ہوئے، نواب نے احتیاطاً سپاہی ساتھ کر دیئے، حریفوں پر جب یہ راز کھلا تو امرائے دربار کے پاس دوڑے، صلاح ٹھہری کہ معاملہ روپیہ یا جاگیر کا نہیں، تم سب مرزا فاخر کو ساتھ لے کر مرزا رفیع کے پاس چلے جاؤ، اور خطا معاف کرا لو،"[۵۳]

رام بابو سکسینہ نے لکھا ہے کہ سعادت علی، ان دنوں ولی عہد سلطنت تھے،[۵۴] جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سعادت علی کے لکھنؤ آنے کے بعد آصف الدولہ نے اپنے بھائی سے کہا تھا کہ اپنے بیٹے غازی الدین حیدر کو "میری فرزندی میں دیدو، اسے میں اپنا جانشین کرونگا

نگران کو توخیال دور دراز اپنا تھا، قبول نہ کیا[۲۲] سکسینہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ معرکۂ مکین وسودا کا تصفیہ نواب سعادت علی خاں نے .... نواب کے روبرو مرزا کی موافقت میں کرا دیا۔[۲۳] لیکن ظاہر ہے کہ ان کا یہ بیان صحیح نہیں،

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اس معرکہ کے واقعات کو جہاں تک عبرت الغافلین سے لکھا ہے وہاں تک تو صحیح لکھا ہے لیکن اس کے بعد انھوں نے اس واقعہ سے متعلق آزاد کے اس حصہ کو نقل کر دیا ہے، جو اوپر درج کیا گیا ہے، البتہ انھیں آزاد کے ان بیانات کو صحیح ماننے میں تردد ہے، کہ مکینؔ کے شاگردوں نے سوداؔ کے پیٹ پر چھری رکھ دی تھی، اور آصف الدولہ نے شیخ زادگان کے محلّہ کو کھدوا کر پھنکوا دینے کا حکم دیا تھا۔[۲۴] اس سے صاف صاف ظاہر ہے کہ اصلح الدین کا قصیدہ ان کی نظر سے نہیں گزرا ہے،

اب سوال یہ ہے کہ معرکۂ مکین وسودا کب ہوا؟ اس معرکہ کی معاصر تفصیلات سے یہ واضح ہے کہ سعادت علی خاں اور مختارالدولہ دونوں اس واقعہ سے وابستہ تھے، اس کا ذکر اوپر آ چکا ہے کہ سعادت علی خاں بریلی سے روانہ ہو کر آصف الدولہ سے فروری ۱۷۷۵ء میں آ کر مل گئے تھے، مختارالدولہ کو ایک سازش کے تحت اٹاوہ میں ۷ اپریل ۱۷۷۶ء کو قتل کر دیا گیا تھا۔[۲۵] اس سے پہلے وہ اور سعادت علی خاں دونوں شوال ۱۱۸۹ھ (نومبر دسمبر ۱۷۷۵ء) تک لکھنؤ میں تھے،[۲۶] پھر ظاہر ہے کہ یہ واقعہ لکھنؤ میں فروری، دسمبر ۱۷۷۵ء کے بیچ کسی وقت ہوا ہوگا،

اس معرکہ پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ:۔

"جھگڑے نے ایسا طول کھینچا کہ نواب آصف الدولہ کے دربار تک نوبت پہنچی، دوسرے دن آصف الدولہ نے سر دربار مرزا فاخر کو بھی بلایا، اور کہا کہ تمہاری

طرف سے بہت نازیبا حرکت ہوئی، اگر شعر کے مرد میدان ہو تو اب رو برو سودا کی ہجو کہو، مرزا فاخر نے کہا ایں از ما نمی آید، آصف الدولہ نے بگڑ کر کہا، درست ایں از شما نمی آید ایں می آید کہ شیاطین خود را بسر مرزائے بیچارہ فرستادید از خانہ ببازارش کشیدند۔ می خواستند آبرویش بخاک ریزند، پھر سودا کی طرف اشارہ کیا، یہاں کیا دیر تھی، فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی،

گوہر بہ بہاں داری وداساقط ازو	تو فخر خراسانی وفا ساقط ازو
مرکب وہٹ خدادیا ساقط ازو	روزاں وشباں زحق تعالیٰ خواہم

انجام یہ ہوا کہ علاوہ انعام واکرام کے چھ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ ہو گیا"[۲۷]

لیکن یہ بھی آزاد کا محض ایک شاخسانہ ہے، کیونکہ ایک معاصر کاغذ سے یہ بات ثابت ہے کہ ۱۷۸۸ء تک سودا کا وظیفہ صرف ۲۳۷۰ دو ہزار تین سو ستر روپیہ سالانہ تھا،[۲۸]

حواشی

[۱] کلیات سودا (کانپور ۱۳۲۳ھ) ص ۲۱،

[۲] آب حیات (الہ آباد ۱۹۷۶ء) صفحات ۷-۱۶۶

[۳] عبرت الغافلین (کلیات سودا) صفحات ۳۳-۷۱

[۴] کلیات سودا صفحات ۵-۲۱-۲۷،

[۵] وقائع زماں نواب آصف الدولہ (مخطوطہ رضا لائبریری رام پور) ۳؛ گیان پرکاشس (مخطوطہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۱۱۴ ب ۱۱۵ الف؛ تاریخ فیض بخش (مخطوطہ سرسالار جنگ میوزیم) ۱۶۴ ب؛ ایس پی ڈی سلکشنس فرام پیشوا دفتر) ج ۳۱ صفحہ ۲-۲۸۲؛ سی۔ پی۔ سی (کلکتہ)

آف پرشین کرس پونڈنس) ۴/۸/ ۱۰۷۰ ؛ طلایۂ المقدور من مطالع الدھور (دہلی ۱۹۱۱ء) ۱۲۸

۶ـہ عماد السعادت (بدایوں کے ایک مخطوطہ کی ذاتی کاپی) ۲۰۲ ؛ تاریخ فرخ آباد (مخطوطہ رضا لائبریری) ۲۰۱ ؛ منتخب تنقیح الاخبار (سلطان المطابع) ۵۴ ،

۷ـہ بی ایس سی (نیشنل آرکائز میں محفوظ) سیکرٹ کنسلٹشن) ۶ر فروری ۱۷۷۵ء ، شجاع الدولہ کا خط وارین ہسٹنگز کو ۶ر فروری ۔

۸ـہ اے ایل سری واستو : شجاع الدولہ آف اودھ (۲ جلد آگرہ ۱۹۶۱ء - ۱۹۷۴) ۹/۲ - ۲۵۸

۹ـہ سی پی سی ۵/ ۲۴۰ ؛ عماد السعادت ۷ - ۱۰۵ ؛ وقائع آصف ۱۰ - ۱۱ ؛ مرقع خسروی مخطوطہ ٹیگور لائبریری لکھنو) ۵۳ - ۵۴ ؛ سلطان التواریخ (مخطوطہ ٹیگور) ۲۴۳ ؛ تاریخ فرخ آباد ۱۷۰ ، ۱۷۹ ، ۲۰۱ ،

۱۰ـہ حامد آفاق قریشی : سعادت علی آف اودھ (لکھنو ۱۹۸۱ء) ۱۳ ۔

۱۱ـہ سی پی سی ۵/ ۲۸۳ ؛ سوانحات : سوانحات سلاطین اودھ (لکھنو ۱۸۷۹ء) ۹۴ ؛

۱۲ـہ سی پی سی ۵/ ۲۸۳

۱۳ـہ عماد السعادت ۱۳۹ - ۱۴۰ ؛ سلطان التواریخ ۲۶۴ ؛ مرقع خسروی ۶۱

۱۴ـہ تاریخ فرح بخش (مخطوطہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) ۲۳۱ ب ۲۳۲ ب ؛ بی ایس سی ، ۲۶ فروری ۱۷۷۶ ؛ برسٹو کا خط بورڈ کو ۱۲ر فروری ؛ سوانحات ۹۵ ۔

۱۵ـہ سی پی سی ۴/ ۱۶۸۳ ، ۱۱/ ۹۸۸ ؛ عماد السعادت ۱۴۱ - ۱۴۲ ؛ وقائع آصف ۱۱ ؛ عقد ثریا (دہلی) ۱۹۳۹) ۹ ۔

۱۶ـہ ہسوے ، ہسٹری آف آصف الدولہ (لکھنو ۱۹۷۱) ۱۵ ؛ مرقع خسروی ۶۱ ۔

۱۷ـہ سری واستو : فرسٹ ٹو نوابس آف اودھ (آگرہ ۱۹۵۴ء) ۳۲ - ۳۳ ، ۱۶۰ - ۱۶۱

۱۸ـہ سودا (لکھنو ۱۹۷۲ء) ۷۵ ،

۱۹ـہ آب حیات ۱۶۷

۲۰ـہ ایضاً ۱۶۷ - ۱۶۸ ۔

۲۱ـہ تاریخ ادب اردو) لکھنو ۱۹۶۹ء) ۱۱۱

۲۲ـہ سوانحات ۹۵

۲۳ـہ تاریخ ادب اردو ۱۱۱

۲۴ـہ لکھنو کا دبستان شاعری (دہلی طبع اول ۱۰۲ - ۱۰۳ ،

۲۵ـہ بی ایس سی ۲۹ر اپریل ۱۷۷۶ نمبر ۳

۲۶ـہ وقائع آصف ۱۴ ؛ مرآۃ السلاطین (نولکشور پریس) ۳/ ۹۹

۲۷ـہ آب حیات ۱۵۱ - ۱۶۸ ،

۲۸ـہ ایبٹرکٹ ریوے نیو اکاونٹ ۱۷۸۰ ، (مخطوطہ نیشنل آرکائز دہلی)

تاریخ اسماء الثقات لابن شاہین

از

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، ایڈیٹر البلاغ، بمبئی

اصول حدیث میں جرح وتعدیل کا علم بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس میں حدیث کے رُواۃ ورجال کی جرح وتعدیل یعنی تضعیف وتوثیق سے بحث کی جاتی ہے، اس کے لیے مخصوص الفاظ اوران کے درجے ہوتے ہیں، اس کا مقصد احادیث رسولؐ اور شریعت کی حفاظت وصیانت ہے، جرح وتعدیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور عہد بہ عہد ائمہ حدیث سے منقول ہے، اس فن کے ائمہ وجہابذہ کے طبقات واسماء کے لیے ابن ابی حاتم رازی کی کتاب تقدمۃ الجرح والتعدیل اور ابن حبان بُستی کی کتاب المجروحون من المحدثین کا مطالعہ کرنا چاہیے،

اس فن میں متقدمین ومتاخرین نے مختلف انداز میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں، بعض میں صرف ثقات، بعض میں صرف ضعفاء، اور بعض میں دونوں طبقوں کا تذکرہ ہے، ثقات اور ضعفاء کی جامع کتابوں میں طبقات ابن سعد، طبقات خلیفہ بن خیاط، التاریخ الکبیر بخاری اور الجرح والتعدیل ابن ابی حاتم رازی مشہور ومتداول ہیں، ثقات پر جو کتابیں لکھی گئیں، ان میں بعض حیثیات سے یہ تین کتابیں زیادہ مشہور ہیں، اور محدثین نے ان کے ساتھ خصوصی اعتنا کیا ہے:

(۱) امام ابوالحسن احمد بن عبداللہ ابن صالح عجلی متوفی ۲۶۱ھ کی کتاب الثقات جس کو امام

تاج الدین سبکی متوفی ۷۷۱ھ اور امام نور الدین ہیثمی متوفی ۸۰۷ھ نے حروف تہجی پر مرتب کیا اور وہ ترتیب الثقات للعجلی کے نام سے مشہور ہے۔

(۲) امام ابوحاتم محمد بن حبان بن احمد بُستی متوفی ۳۵۴ھ کی کتاب الثقات، یہ اپنے موضوع پر بہت مشہور کتاب ہے، اور چند سال ہوئے دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد میں چھپ گئی ہے۔

(۳) امام ابوحفص عمر بن احمد بن عثمان الواعظ المعروف بابن شاہین بغدادی متوفی ۳۸۵ھ کی کتاب الثقات۔

یہ عجیب بات ہے کہ امام ابن شاہین کی تین سو ساٹھ (۳۶۰) سے زائد تصانیف ہیں، ان کے کسی تذکرہ نگار نے اس کتاب کا ذکر نہیں کیا ہے، ہماری محدود معلومات میں صرف حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ نے تہذیب التہذیب میں جابجا رُواۃ ورجال کے ذکر میں عجلی اور ابن حبان کے ساتھ ابن شاہین کا قول ان کی کتاب الثقات سے نقل کیا ہے، اور قال ابن شاہین فی الثقات کی تصریح کی ہے، نیز حافظ ابن حجرؒ نے بعض مقامات پر اس کتاب کے آخری حصہ المختلف فیہم سے قال ابن شاہین فی المختلف فیہم لکھ کر ان کا قول درج کیا ہے، چلپی نے کشف الظنون میں اس کی نسبت خلیل ابن شاہین کی طرف کی ہے[1]، اور شیخ عبدالعزیز خولی مصری نے بھی مفتاح السنہ میں اسی کو نقل کیا ہے[2]، خلیل ابن شاہین نویں صدی کے ظاہری عالم ہیں، اس موضوع پر ان کی کتاب نہیں ہے، صحیح یہ ہے کہ یہ ابوحفص ابن شاہین کی کتاب ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن شاہین کی کتاب الثقات ہمیشہ سے نادر الوجود رہی ہے، اس لیے محدثین کے یہاں اس کا تذکرہ نہیں ملتا ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۳ رجب ۱۱۷۳ھ جامع مسجد بمبئی کے کتب خانہ میں موجود ہے، کاغذ دبیز سفید، کتابت عربی رسم الخط میں جلی، سائز متوسط، کل صفحات ایک سو ستائیس (۱۲۷)

---

[1] کشف الظنون ج ۱، ص ۳۵۵، طبع ترکی۔　[2] مفتاح السنۃ ص ۱۵۲۔

ہر صفحہ میں پندرہ ۱۵ سطریں ہیں، کاتب صنعاء کے ایک زیدی المذہب عالم احمد بن یوسف بن حسین ہیں جن کا نسبی تعلق یمن کے حکمراں اسرۂ قاسمیہ سے ہے، کاتب نے منقول عنہ نسخہ کے بارے میں کوئی تصریح نہیں کی ہے کہ یہ نسخہ کس نے، کب اور کہاں لکھا ہے، البتہ حاشیہ میں بعض جگہ اس کو "الام" لکھا ہے، نیز تقریب التہذیب سے حاشیہ میں متعدد رواۃ کے بارے میں مزید معلومات درج کی ہیں، اسی سلسلہ میں ایک جگہ حضرت سمرہ ابن جندب رضی اللہ عنہ کے متعلق بغض و عداوت کا سخت لہجہ میں مظاہرہ کیا ہے جس سے کاتب کا رفض و تشیع نمایاں ہوگیا ہے، اسی سے نقل کردہ نسخہ کا عکسی نسخہ جامعۂ اسلامیہ مدینہ منورہ کے کتب خانہ میں ہے جیسا کہ اس کے ترقیمہ سے معلوم ہوتا ہے، میں نے ۸ ر ذوقعدہ ۱۴۰۲ھ میں اس کو دیکھا ہے۔

کتاب کا نام پہلے صفحہ پر یوں لکھا ہے:

كتاب تاريخ اسماء الثقات ممن نقل عنهم العلم

على حروف المعجم، عن ابی حفص عمر بن احمد

ابن شاهين رضی الله تعالیٰ عنه

امین

نیچے بائیں طرف فارسی رسم الخط میں ایک تملیک یوں ہے: "من فضل الله سبحانه وتعالى على الفقير الحقير المعترف بالعجز والتقصير المذنب الجانی یوسف بن احمد بن الحسين بن الحسن بن امير المؤمنين المنصور بالله رب العالمين القاسم بن محمد ابن علی رضوان الله تعالى على الجميع، بتاريخ ؟ شهر ذی قعدة ۱۱۹۱ھ"

اور آخر میں ترقیمہ یوں ہے: "آخر کتاب اسماء الثقات ممن نقل منه العلم على حروف المعجم، الحمد لله وحده وصلى الله على سيدنا محمد وآله وصحبه وسلم، كان الفراغ من رقمه ليلة الاحد ثالث عشر من شهر رجب احد شهور سنة ثلاثة وسبعين ومأية والف من هجرته صلى الله عليه وآله وسلم، بخط اسير ذنبه ورهين كسبه الفقير الى رحمة الله (تعالیٰ؟)

احمد بن یوسف بن حسین بن حسن بن المنصور بالله القاسم بن محمد بن علی رضوان الله علیه وسلامه۔

کاتب اور مالک دونوں اہل علم کا نسبی تعلق شمالی یمن کے زیدی المذہب حکمراں قاسمی خاندان سے ہے جس کا نسب حضرت حسن رضی اللہ عنہ تک پہونچتا ہے، اس کے بانی و مورث قاسم بن محمد بن علی ۹۶۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۰۰۶ھ میں صنعاء کے حکمراں خاندان شرف الدین پر قبضہ کرکے الامام المنصور باللہ کا لقب اختیار کیا، اور امام یمن بن کر وفات ۱۰۲۹ھ تک حکومت کی، اسی زیدی امامت و سلطنت کا خاتمہ ۱۹۶۲ء میں شمالی یمن کے عوامی انقلاب پر ہوا۔

علامہ شوکانی نے البدر الطالع میں اس نسخہ کے کاتب کا حال لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سید احمد بن یوسف بن حسین بن حسن بن امام قاسم کی ولادت ۱۱۲۰ھ کے بعد ہوئی اور اواخر جمادی الآخرۃ ۱۱۹۱ھ میں فوت ہوئے، صنعاء میں نشو و نما ہوئی اور وہیں کے علماء سے تحصیل علم کی، محقق، علامہ، محدث، علم سنت کے ماہر اور رجال و حدیث کے حفظ میں مشہور تھے، علم حدیث میں رسوخ و تبحر کی وجہ سے ان کا لقب حدیث تھا، ساتھ ہی جملہ علوم آلیہ کے جامع اور شعر و ادب میں ید طولیٰ رکھتے تھے، مجموعۂ امام زید بن علی کی نہایت نفیس تخریج لکھی تھی جو علم الروایہ میں ان کی مہارت کی دلیل ہے، نہایت متواضع، خوش خلق، باوقار اور صابر و شاکر عالم تھے۔[1]

کاتب سید احمد بن یوسف بن حسین کے جمادی الآخرۃ ۱۱۹۱ھ میں انتقال کے چند ماہ بعد یہ نسخہ یوسف بن احمد بن حسین کی ملکیت میں آیا، یہ غالباً کاتب کے چچازاد بھائی ہیں، یمن کے بہت سے زیدی العقیدہ اہل علم فروعات اور فقہی مسائل میں شافعی، حنبلی وغیرہ تھے، یہ دونوں اہل علم غالباً فروعات میں فقہ اہل سنت پر عامل تھے، فرقۂ زیدیہ شیعوں میں زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا

---

[1] البدر الطالع ج ۱، ص ۱۲۸ تا ص ۱۳۰۔

متبع ہے، اس کے عقیدہ میں امامت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد میں دائر و سائر ہے، اور افضل کے ہوتے ہوئے مفضول کی امامت جائز ہے، تفصیل کے لیے الملل والنحل شہرستانی وغیرہ ملاحظہ ہو۔

دوسرے صفحہ سے اصل کتاب شروع ہوتی ہے، ہم یہ پورا صفحہ نقل کرتے ہیں جس سے کتاب کے راوی، نام اور غرض و غایت اور اس کے مندرجات کا حال معلوم ہوتا ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم (عونک اللّٰہم، اللّٰہم صلّ علی سیّدنا محمّد وآلہ) اخبرنا الشیخ ابو عبد اللہ محمّد بن ابی نصر بن عبد اللہ الحمیدی رضی اللہ عنہ قراءۃً علیہ فی منزلہ ببغداد، قال: انا الشیخ الامام القاضی الشریف ابو الحسین محمّد بن علی بن المہتدی باللہ فی الاجازۃ وغیرہ، عن ابی حفص عمر بن احمد بن شاہین الواعظ رحمہ اللہ تعالیٰ، قال: کتاب اسماء الثقات ممّن روی الحدیث ممّن انتہیٰ الینا ذکرہٗ عن نُقّاد الحدیث ممّن قبلت شہادتہٗ واشتہرت عدالتہٗ وعرف ونقل، مثل یحییٰ بن سعید القطّان، وعبد الرحمٰن بن مہدی، و یحییٰ بن معین، واحمد بن محمّد بن حنبل، وعلی بن المدینی، وعثمان ابن ابی شیبۃ، ومحمّد بن عبد اللہ بن عباد[1] الموصلی، واحمد بن صالح، ومثل من تقدمہم ومثل من قاربہم، واخرجت اسماء الثقات علیٰ حروف المعجم لیقرب للناظر فیہ اسم من قصدہٗ، وباللہ نستعین وعلیہ نتوکّل۔

اس مقدمہ کے بعد باب الالف سے من اسمہ اسمٰعیل کے عنوان سے اصل کتاب ہے، اس کتاب کے پہلے راوی امام ابن شاہین کے خاتمۃ الاصحاب اور تلمیذ رشید شیخ ابو الحسین محمد بن علی ابن محمد بن مہتدی باللہ متوفی ۴۶۵ھ ہیں جو ابن الغریق کی کنیت سے مشہور ہیں، زہد و تقویٰ اور

[1] عمار صحیح ہے، ابو جعفر محمد بن عبد اللہ بن عمار موصلی، صاحب التاریخ، متوفی ۲۴۲ھ۔

عبادت میں اس قدر آگے تھے کہ ان کو زاہد بنی ہاشم کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، وہ دنیا میں آخری عالم و محدث تھے جنھوں نے امام دارقطنی، امام ابن شاہین اور امام ابوبکر بن درست سے روایت کی تھی اور اہل علم نے ان کے ذریعہ ان تینوں ائمۂ حدیث کی مرویات کی روایت کی[1]، اور ابن المہتدی سے شیخ ابو عبد اللہ محمد بن ابی نصر فتوح حمیدی متوفی ۴۸۸ھ نے اس کتاب کی روایت کی، مشہور ظاہری امام ابن حزم کے صحبت یافتہ اور خود ظاہری مسلک کے عالم تھے، ان کی کتاب الجمع بین الصحیحین بہت مشہور ہے[2]۔

ابن شاہین نے جیسا کہ مقدمۃ الکتاب میں بتایا ہے اس میں صرف ائمۂ جرح و تعدیل کے اقوال درج ہیں، وہ بھی نہایت اختصار کے ساتھ، کسی کسی راوی کے حال پر کچھ روشنی بھی ہے، ابن شاہین نے شاید ہی کہیں اپنی ذاتی رائے درج کی ہو، کہیں اپنی سند سے اور کہیں بے سند کے اقوال نقل کیے ہیں، ان کی حیثیت صرف ناقل اور جامع کی ہے، نمونہ ملاحظہ ہو:

من اسمہ اسمٰعیل

نا الحسین بن احمد بن صدقۃ، نا احمد بن ابی خیثمۃ، قال: سمعت بن معین یقول: من سئل ابن مہدی عن اسمٰعیل - یعنی ابن ابی خالد، فقال: ثقۃ، واثنی علیہ الشعبی۔

وقال یحییٰ بن معین: اسمٰعیل بن مسلم المخزومی مکی ثقۃ، یروی عنہ وکیع یحدث عن عبد اللہ بن عبید بن عمیر۔

وقال ابن معین اسمٰعیل بن مسلم العبدی ثقۃ، وھو بصری، روی عن ابن معین۔

اسمٰعیل بن امیۃ اذا حدث عن الثقۃ فہو ثقۃ، قالہ ابن معین۔

[1] المنتظم ج ۸، ص ۲۸۳ [2] العبر ج ۳، ص ۳۲۳۔

اسمٰعیل بن سُمیع کوفی ثقۃ، وقال مرۃً اخریٰ: ثقۃ مامون۔

نا محمد بن مخلد، نا صالح بن احمد بن حنبل، نا علی بن المدینی: قیل لیحییٰ ابن معین: نا السدی: یعنی اسمٰعیل بن عبد الرحمٰن؟ قال: السدی عندنا لا بأس بہ۔

نا یحییٰ بن محمد بن صاعد و محمد بن ھارون الحضرمی قالا: نا ابوھشام الرفاعی، نا اسمٰعیل بن شعیب السمان۔ وکان ثقۃ۔

وقال احمد بن صالح المصری: اسمٰعیل بن ابی حکیم، عن عبیدۃ بن سفیان ھٰذا من اثبت اسناد اھل المدینۃ، اسمٰعیل لہ شأن، وقال یحییٰ بن معین: اسمٰعیل ابن ابی حکیم صالح (ص۳)

حافظ ابن حجرؒ نے اسمٰعیل بن ابی حکیم کے ذکر میں ابن شاہین سے یوں نقل کیا ہے: قلت: ونقل ابن شاھین فی الثقات عن احمد بن صالح قال: اسمٰعیل بن ابی حکیم عن عبیدۃ ابن سفیان، ھٰذا من اثبت اسانید اھل المدینۃ[1]

یہ کتاب امام ابن شاہین کے اس قول کی آئینہ دار ہے:

انا اکتب ولا اعارض (میں لکھتا ہوں اور اس کا اصل سے مقابلہ نہیں کرتا) اور جمیع ماخرجتُہ وصنفتُہ من حدیثی لم اعارضہ بالاصول (یعنی میں نے اپنی احادیث و مرویات کی تمام تخاریج و تصانیف کا اصول سے مقابلہ نہیں کیا ہے)[2] پوری کتاب میں مکررات بہت زیادہ ہیں، کہیں ایک ہی عبارت مکرر ہے، کہیں معمولی سا فرق ہے، کہیں کمی زیادتی ہے، کئی اسماء تین تین بلکہ چار چار بار آگئے ہیں، بعض ابواب میں دوسرے ابواب کے اسماء آگئے ہیں، ایک قسم کے اسماء میں دوسرے قسم کے اسماء درج ہیں، بعض مقامات میں عبارتیں بے محل ہیں،

۱؎ تہذیب التہذیب ج۱، ص ۲۸۹ ۲؎ تاریخ بغداد ج ۱۱، ص ۲۶۸۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب پر نظر ثانی کی باری نہیں آسکی۔

حافظ ابن حجرؒ نے اس کتاب سے ائمہ جرح و تعدیل کے جو اقوال نقل کیے ہیں بعض مقامات پر ان میں اور کتاب میں فرق ہے، بعض اقوال کتاب میں نہیں ہیں، اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

کتاب میں اسمٰعیل بن ابی حکیم کے ذکر میں اسناد اھل المدینۃ ہے، اور تہذیب التہذیب میں اسی سے نقل میں اسانید[1] ہے۔ اسمٰعیل بن حجارہ کے ذکر میں ابن معین کا یہ قول درج ہے: وکان اعمیٰ، ولم یکن بہ بأس، مگر تہذیب التہذیب میں اسی سے یوں نقل ہے: وحکی ابن شاھین عن عثمان بن ابی شیبۃ انہ لا یسوی شیئاً[2]۔ حالانکہ یہ عبارت کتاب میں نہیں ہے

ابوعون محمد بن عبید اللہ بن سعید ثقفی کوفی کے تذکرہ میں ابن حجرؒ نے لکھا ہے: وقال ابن شاھین فی الثقات: ھو اوثق من عبد الملک بن عمیر[3]۔ یہ قول کتاب میں نہیں ہے، حفص بن سلیمان منقری کے بارے میں یحییٰ بن معین کا قول ثقہ درج ہے، اور ابن حجر نے ان کے حال میں لکھا ہے وقال ابن شاھین فی الثقات: قال احمد بن حنبل: ھو صالح[4]۔ یہ قول کتاب میں نہیں ہے۔

پیش نظر نسخہ ناقص بھی ہے، درمیان سے متعدد تراجم غائب ہیں، مثلاً سفیان بن حبیب ابو محمد بزار بصری کے بارہ میں ابن حجرؒ نے لکھا ہے: وذکرہ ابن شاھین فی الثقات وقال: قال عثمان ابن ابی شیبۃ الخ[5] اور کتاب میں ان کا ذکر نہیں ہے، سالم بن نوح بن ابو عطا بصری کے حال میں ابن حجرؒ نے لکھا ہے: ذکرہ ابن شاھین فی الثقات وقال: قال ابن معین الخ[6] حالانکہ کتاب میں ان کا تذکرہ نہیں ہے، اسی طرح بعض اور تراجم اس نسخہ سے ساقط ہیں، ابتداء کے چند ابواب میں متفق الاسماء کے ذیلی عنوانات ہیں، بعد میں اس کا التزام نہیں ہے، اسماء کے ذکر میں

۱؎ تہذیب التہذیب ج۱، ص ۲۸۹ ۲؎ التہذیب ج۱، ص ۳۲۹ ۳؎ تہذیب التہذیب ج۹، ص ۳۲۲ ۴؎ ایضاً ج۲، ص ۴۰۲ ۵؎ ایضاً ج۴، ص ۱۰۷ ۶؎ ایضاً ج۳، ص ۴۴۳۔

ترتیب کا اہتمام بھی نہیں ہے، پوری کتاب میں ۱۴۸۰ سے زائد تراجم ہیں، جن میں بہت سے مکررات بھی شامل ہیں.

تراجم کے خاتمہ پر ص ۱۲۱ تا ۱۲۵ امام ابن شاہین نے اپنی سند کے ساتھ ایمۂ جرح وتعدیل کے اقوال واحوال بیان کیے ہیں، اس کا کوئی عنوان نہیں ہے، بظاہر یہ حصہ کتاب کی ابتدا میں مقدمہ کے طور پر ہونا چاہیے تھا، اسی بیان پر کتاب ختم ہے اور کاتب نے لکھ دیا ہے: آخر کتاب تاریخ اسماء الثقات ممن نقل منه العلم الخ. اس کے بعد ص ۱۲۶ تا ۱۲۸ المختلف فیهم کا کچھ درمیانی حصہ درج ہے، اس کا بھی کوئی عنوان نہیں ہے، حافظ ابن حجرؒ نے تہذیب التہذیب میں اس کو المختلف فیهم بتایا ہے، چنانچہ جعفر بن سلیمان ضبعی کے حال میں لکھا ہے قال ابن شاہین فی المختلف فیهم، اس کے بعد اس کی عبارت نقل کی ہے، اسی طرح بعض دوسرے تراجم میں اس کا تذکرہ اسی عنوان سے کیا ہے، ابو القاسم حمزۃ بن یوسف سہمی جرجانی متوفی ۴۲۷ھ امام دارقطنی کے شاگرد ہیں، امام ابن شاہین سے بھی روایت کی ہے، ان کی کتاب تاریخ جرجان ۱۳۶۹ھ میں دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد میں چھپی ہے، اس کے آخر میں ص ۵۰۵ تا ۵۱۵ اس کا ابتدائی حصہ چھپا ہے، اس میں شروع اس طرح ہے:

قال: وحدث القاضی الشریف ابو الحسن محمد بن علی بن محمد بن المهتدی بالله اجازةً عن ابی حفص عمر بن احمد بن عثمان بن شاہین الواعظ رحمه الله قال: ذکر من اختلف العلماء ونقاد الحدیث فیه، فمنهم من وثّقه ومنهم من ضعّفه ومن قیل فیه قولان، بیّنت ذٰلك بالتراجم لیعرف ان شاء الله تعالیٰ. ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی علیحدہ کتاب ہے جس کی روایت حمیدی نے ابن المہتدی سے اور انھوں نے ابن شاہین سے کی ہے، حافظ ابن حجرؒ نے چند مقامات پر قال ابن شاہین فی المختلف فیهم لکھ کر

ان کا قول نقل کیا ہے، جب کہ صدہا مقامات پر کتاب الثقات سے ان کا قول نقل کرتے وقت قال ابن شاہین فی الثقات لکھا ہے، اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مستقل کتاب ہے، پھر اس کا انداز کتاب الثقات سے بالکل جداگانہ ہے، اس میں ابن شاہین راوی کے بارے میں علمائے جرح وتعدیل کے متضاد اقوال بیان کرکے اپنی رائے فیصلہ کے طور پر ظاہر کرتے ہیں، صرف جامع اور ناقل نہیں ہیں، مثال ملاحظہ ہو:

جعفر الجعفی والخلاف فیه

روی ابن شاہین: ان عبد الرحمن بن مهدی قال: سمعت سفیان الثوری یقول: ما رأیت احداً اورع فی الحدیث من جابر ولا منصور، وعن سلام ابن ابی مطیع انه قال: قال لی جابر الجعفی: عندی خمسون الف باب من العلم ما حدثت به احداً، فذکرت ذٰلك لایوب، فقال: اما الآن فهو کاذب، وعن زائدة انه قال: کان جابر الجعفی کذّاباً، کان یؤمن بالرجعة، وعن ابی حنیفة انهٗ قال: ما رأیت احداً اکذب من جابر، ولا افضل من عطاء، وعن یحییٰ بن معین انه قال: جابر الجعفی لا یکتب حدیثه ولا کرامة، وقال یحییٰ مرّةً اخریٰ: جابر الجعفی لیس بشیء.

قال ابو حفص: وهذه الروایات فی جابر مختلفة جدّاً، یقول الثوری: لم ار اورع منه فی الحدیث، ویقول ایوب السختیانی: هو کذّاب، ویقول زائدة وابو حنیفة: هو کذّاب، ویقول یحییٰ بن معین کذٰلك، واقل ما فی هذا الرجل ان یکون حدیثه لا یحتج به الا ان یروی حدیثاً یشارکه فیه الثقات، فاذا انفرد هو بحدیث لم یعمل علیه لتفضیل سفیان له

ثقات ابن شاہین اور تاریخ جرجان دونوں کے آخر میں اس کا جس قدر ناقص الآخر حصہ ہے، اس میں یہی طریقہ ہے کہ ابتدا میں رو ی ابن شاہین کہہ کر ایمہ کے مختلف اقوال نقل کیے ہیں اور آخر میں قال ابو حفص کہہ کر اپنی رائے ظاہر کی ہے، افسوس کہ المختلف فیھم کا زیادہ حصہ غائب ہے، ابتداء کے صرف ۱۵ تراجم ہیں۔

میں نے ۱۳۹۸ھ میں محترم مولانا غلام محمد صاحب خطیب جامع مسجد بمبئی کی عنایت سے ابن شاہین کی کتاب الثقات کو نقل کیا تھا، اس کی خبر کسی طرح شکاگو امریکہ میں مقیم ایک ازہری فاضل شیخ احمد زکی حماد کو ملی اور موصوف نے شوال ۱۳۹۹ھ میں ایک مفصل مکتوب میرے پاس روانہ کیا، جس میں لکھا کہ میں "الحافظ ابن شاہین' حیاتہ ومؤلفاتہ" کے موضوع پر تحقیقی کام کر رہا ہوں، ان دنوں ان کی تصانیف کا باب در پیش ہے جن میں تاریخ اسماء الثقات ممن نقل عنھم العلم نہایت اہم کتاب ہے، اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ بمبئی میں آپ کے پاس اس کا ایک نادر قلمی نسخہ موجود ہے، مہربانی فرما کر اس کا عکسی فوٹو مجھے روانہ کر دیں، میں نے اس زمانہ میں اس کی فوٹو کاپی ان کو بھیجدی، خدا کرے یہ نادر اور اہم کتاب جلد چھپ کر اہل علم کی خدمت میں پہونچ سکے۔

آثار علمیہ و ادبیہ

ولی عہد نیپال کا خط

مولانا عبد الحمید فراہیؒ کے نام

از

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، ریڈر ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد

مولانا فراہیؒ کے نام ولیعہد نیپال کا یہ خط جو اردو میں ہے مجھے دائرۂ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڈھ سے ۱۹۷۹ء میں ملا تھا، جب میں ہندوستان گیا تھا، یہ واقعہ ہے کہ دائرۂ حمیدیہ کے ناظم مولانا بدر الدین اصلاحی اور معتمد جناب عبد الرحمٰن ناصر اصلاحی جامعی نے اسے میرے حوالے کر کے ایثار و برادر نوازی کا جو ثبوت دیا اس کی مثال ملنی مشکل ہے، ستر سال کا پرانا یہ خط جو گذشتہ پچاس سال (مولانا فراہیؒ کی وفات ۱۹۳۰ء) سے دائرۂ حمیدیہ میں محفوظ تھا، اسے یوں کسی کے حوالہ کر دینا کوئی معمولی بات نہیں، میں ایک برادر خورد کی حیثیت سے ان دونوں کا بزرگوں کا ممنون ہوں، مجھے خوشی ہے کہ میں یہ تاریخی دستاویز تاریخ کے اوراق میں محفوظ کر کے اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جاؤں گا، جو اس کو اپنی تحویل میں لے کر میں نے خود اپنے اوپر عائد کر لی تھی،

گذشتہ چار سال سے یہ علمی امانت میرے پاس طاق نسیاں کی زینت بنی پڑی رہی ہے، فکر و نظر کی مصروفیات اور دنیوی فکر و ہات نے خود اپنے ہی قدموں کے نشان کو پلٹ کر

دیکھنے کی مہلت نہ دی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں پہلے اس کی طرف توجہ نہ دے سکا، اخویم ناصر اصلاحی نے مختصراً بتادیا تھا کہ یہ خط ولیعہد نیپال کا ہے لیکن روداد دی میں اس وقت میرے لئے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا ممکن نہ تھا۔ میں نے اس خیال سے اسے اپنے کاغذات میں رکھ لیا کہ مولانا فراہیؒ کے نام ہے تو اس میں ضرور کوئی نہ کوئی بات میرے کام کی ہوگی۔

اس خط کی نسبت میرے ذہن میں ایک الجھن یہ تھی کہ کہاں نیپال اور کہاں پھریہا اور سرائے میر، کہاں ایک شہزادہ اور ولیعہد اور کہاں ایک عالم دین، نیپال کے ولیعہد کو ایسی کیا ضرورت پیش آئی کہ اس نے مولانا فراہیؒ کو خط لکھا، لیکن یہ الجھن خط پڑھنے کے بعد خود بخود دور ہوگئی۔

یہ خط اندازاً اب سے کوئی ستر سال پہلے لکھا گیا، اور یہ محض اتفاق ہے کہ وہ دست بردِ زمانہ سے بچ بچا کر مجھ تک پہنچ گیا، آج اس کے ما لہٗ و ما علیہ کو جانچنے کیلئے کوئی چیز با آسانی مل سکتی ہے، تو وہ خود خط کی اپنی داخلی شہادتیں ہیں، اور یہ واقعہ ہے کہ اگر خود خط کے اندر ایسے ناقابلِ تردید شواہد موجود نہ ہوتے تو کاتب اور مکتوب الیہ دونوں ہی کی نسبت یقین سے کچھ کہنا مشکل تھا، غنیمت ہے کہ خط کے ساتھ اس کا لفافہ بھی محفوظ رہا، ورنہ اس کی بعض گتھیاں کسی طور نہ سلجھ سکتی تھیں، اس لئے کہ مکتوب الیہ کا نام صرف لفافے پر درج ہے، کسی زیرک شاعر نے کہا ہے،

ع خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر

لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کے برعکس معاملہ بھی صحیح ہو، کم از کم اس خط میں یہ صورت ممکن نہیں تھی، خط کے مضمون سے لفافے کے اندراجات کا پتہ لگانا دشوار تھا،

لفافے کے علاوہ اس کا ملفوف تین الگ الگ اوراق پر مشتمل ہے، دو ورق دو غزلوں کے ہیں

ایک ورق خط کا ہے، ان چار متفرق چیزوں کے باہمی تعلق کو واضح کرنے کے لیے بھی ہمیں خارجی شہادتوں سے زیادہ داخلی شہادتوں پر اعتماد کرنا ہوگا، بہت غور سے مطالعہ کرنے کے بعد میں پورے اطمینان سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ خط ولیعہد نیپال کا ہے جو اس نے مولانا فراہیؒ کو لکھا، خط کے ساتھ اس نے اپنی دو فارسی غزلیں بھی اصلاح کی غرض سے ارسال کیں،

غزلوں کے دو ورقوں کا کاغذ عام معمولی کاغذ ہے اس کے برعکس خط اور لفافے کا کاغذ نہ صرف خاص بلکہ بہت اعلیٰ درجے کا شاہی کاغذ ہے جس پر وقت اور زمانے کا ابھی کوئی اثر نظر نہیں آتا، لفافے اور خط دونوں کا کاغذ ایک ہے، یہ دبیز بھی ہے اور رنگین بھی، ہلکا نیلگوں جس سے شاہانہ خوش ذوقی ظاہر ہوتی ہے، غزلوں کے کاغذ اور خط کے کاغذ میں اتنا تفاوت ہے کہ اگر بعض دوسری باتوں سے اس کی تائید نہ ہوتی تو بڑی آسانی سے کہا جاسکتا تھا کہ غزلیں کسی اور کی ہیں اور خط کسی اور کا ہے، تعجب ہوتا ہے کہ ولیعہد موصوف کے شاہی ذوق نے یہ کیسے گوارا کر لیا کہ اپنے ہی کلام کے لیے اتنا معمولی بلکہ گھٹیا کاغذ استعمال کیا جب کہ خط کے لئے اتنا غیر معمولی اور بڑھیا کاغذ کو کام میں لائے کہ اتنی مدت گذرنے کے بعد بھی اس کی آب و تاب میں کوئی خاص فرق نہیں آیا، نہ کہیں سے مڑا نہ جھڑا نہ کٹا نہ پھٹا نہ کرم کتابی کی غذا بنا، خط کے اندر بغرض اصلاح دو غزلیں بھیجنے کا ذکر ہے، غزلوں کے مقطع میں جو تخلص نظم ہوا ہے، وہی تخلص خط کے آخر میں نام کے ساتھ بھی درج ہے اس لئے یہ قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں غزلیں وہی ہیں جن کا ذکر اس خط میں ہے، خط کا کاتب اور غزلوں کا شاعر ایک ہی شخص ہے، رہا اس بات کا ثبوت کہ یہ خط مولانا فراہیؒ کے نام ہے تو وہ ہمیں لفافے سے مل جاتا ہے، لفافے کا مضمون یوں ہے۔ "بخدمت فیضدرجت جناب مولانا مولوی عبدالحمید صاحب

بی۔ اے مشرف باد"۔ یہ بات البتہ غور طلب ہے کہ ولیعہد نے مولانا کا معروف نام حمیدالدین

چھوڑ کر عبد الحمید لکھا ہے، جو صرف ان کی تصانیف میں ملتا ہے، اندازہ ہوتا ہے کہ ولیعہد
مولانا کے اسی نام سے واقف تھا، مولانا نے اسے کبھی خط لکھا ہوگا یا کوئی غزل بھیجی ہوگی، اور
اس میں عبد الحمید ہی لکھا ہوگا، اس لیے یہی نام اس نے لفافے پر تحریر کیا، مولانا کے خط لکھنے کی
تو کوئی شہادت نہیں ملی، ولیعہد کی فرمائش پر غزل لکھنے کا ثبوت البتہ موجود ہے، ولیعہد کی فرمائش
پر غزل لکھی تو اسے بھیجی بھی ضرور ہوگی اور خط بھی ضرور لکھا ہوگا، جس میں اپنے نام کا ذکر لازماً
کیا ہوگا، ماہنامہ "الاصلاح" کے ستمبر ۱۹۳۶ء کے شمارہ میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے مولانا فراہیؒ
کے "اشعار" کی ایک فارسی غزل شائع کی، "نمی بینم" جس کی ردیف اور گیہاں، خنداں، ریحاں،
مژگاں، درماں، پیماں، ساماں وغیرہ جس کے قافیے ہیں، اس غزل کے ساتھ کا ادارتی نوٹ
اور خود غزل کا آخری شعر اس ضمن میں لائق توجہ ہے، پہلے نوٹ ملاحظہ ہو:

"نیپال کے شاہی خاندان کے کوئی رکن الہ آباد میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے
تھے، فارسی میں شعر و سخن کا مذاق رکھتے، اور شادی تخلص کرتے تھے، اس تقریب سے مولانا سے راہ
و رسم ہوئی، مولانا نے یہ غزل ان کی فرمائش سے لکھی"

(الاصلاح ستمبر ۱۹۳۶ء ص ۵۵)

اس غزل کے آخری شعر میں مولانا نے لفظ "شادی" کو اس طرح نظم کر دیا ہے کہ اس سے
خوشی کے معنی بھی نکلتے ہیں، اور فرمائش کرنے والے کا تخلص بھی مفہوم ہوتا ہے، لفظ شادی پر
تخلص کی علامت (ؔ) لگا کر اس اشارے کو اور کھول دیا گیا ہے، یہ غزل مولانا کے فارسی مجموعہ
کلام "نوائے پہلوی" مرتبہ مولانا بدر الدین اصلاحی مطبوعہ ۱۹۶۷ء میں بھی شامل ہے، اور
اس کے ساتھ مرتب کا یہ نوٹ ہے، "بفرمائش راجہ نیپال کہ شادی تخلص می کرد، گفتہ آمد" (نوائے
پہلوی حصہ سرود پارسی ص ص ۱۷-۱۸)، غزل کی شان نزول بہت ممکن ہے مولانا نے اصل

مسودے میں خود بھی اپنے قلم سے لکھ دی ہو، اس مجموعے کی اشاعت تک ولیعہد یقیناً راجہ ہو گیا
ہوگا، اور اس کی جلاوطنی کے دن بھی ختم ہو گئے ہوں گے نوائے پہلوی میں بھی شعر کے اندر شادی کے
لفظ کو جلی خط میں لکھ کر نمایاں کیا گیا ہے، جو اسم خاص کو ظاہر کرنے کا ایک طریقہ ہے، مولانا کے
فارسی کلام کا جو مجموعہ ۱۹۰۳ء میں "دیوان حمید" کے عنوان سے مطبع شمس حیدر آباد دکن میں چھپ کر
مولانا کے چھوٹے بھائی حاجی رشید الدین مرحوم نے شائع کیا تھا اس میں یہ غزل نہیں ہے، یہ اس لیے کہ
اس دیوان کی اشاعت کے بعد یہ غزل کہی گئی ہو، یقیناً تشنگی محسوس کی جائے گی اگر اس غزل کا
آخری شعر نقل نہ کیا گیا۔

زرنگ و بوے گلزار جہاں دل شاد کے گردد — پے شادیؔ رہے جز طاعتِ یزداں نمی بینم

اس خط کے اندر جو شہادتیں اس بات کے حق میں جاتی ہیں کہ مکتوب الیہ مولانا فراہیؒ ہیں
ان میں سے ایک تو خط کے متن کا یہ جملہ ہے، "محمد رضا صاحب آپ کے بھائی مولوی محمد اسحاق
صاحب کے بہت قدیمی یار غار ہیں" مولوی محمد اسحاق وکیل ہائی کورٹ الہ آباد علامہ شبلیؒ کے سگے بھائی
اور مولانا فراہی کے پھوپھی زاد بھائی تھے، اس رشتے کے علاوہ دونوں میں دوستی بھی تھی،
دوسرے جو لوگ مولانا فراہی کا خط پہچانتے ہیں اُن کی شناخت کے لیے ایک غزل کے نیچے مولانا کے
ہاتھ کی لکھی ہوئی جان محمد قدسی کی ایک رباعی کافی ہے جو ولیعہد کی غزل پر مولانا کا بے لاگ تبصرہ ہے،
خط کے کاتب کے متعلق جو شہادتیں ہیں اُن میں سب سے اہم وہ شاہی مونوگرام ہے جو خط
کے کاغذ کی پیشانی پر بھی ڈائی کا چھپا ہوا ہے اور لفافے کے زاویے پر بھی مونوگرام خود ایک دلچسپ
داستان ہے، اس میں سرخ، سنہرا اور رہرا تین رنگ ہیں، اتنا وقت گذرنے کے بعد بھی کوئی رنگ
مدھم نہیں ہوا، نیپال کے دو جھنڈے کراس کر کے ایک طرف سے ہاتھی اور دوسری طرف سے
شیر اسے تھامے ہوئے ہے، دونوں پھریروں کے بیچ ایک ستارہ ہے، ستارے کے اندر کسی آدمی کا

چہرہ ہے، جو ہو بہو خود ولیعہد کا ہے یا اس کے کسی بزرگ کا ہو۔ نیپالی حروف میں یوبراج اور لاطینی میں Scientia est vis لکھا ہوا ہے، یوبراج نیپالی میں ولیعہد کو کہتے ہیں، یہی لفظ سنسکرت میں "یوراج" بمعنی ولیعہد ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نیپال کے ولیعہد کی ذاتی مہر یا مونوگرام ہے، لاطینی تحریر کا مطلب ہے "علم طاقت ہے" نیپالی میں پروفیسر مولانا عبدالقدیر ہاشمی اور لاطینی میں محمود احمد غازی سے مدد لی، اگر ان دو حضرات کی مدد حاصل نہ ہوتی تو یہ عقدہ لاینحل رہتا۔ فجزاھم اللہ حسن الجزاء۔

یہ مونوگرام صفحہ کے بیچ میں ہے، صفحہ کے اوپر دائیں طرف غور سے دیکھیں تو ڈاک کی داب سے ابھرے ہوئے انگریزی حروف میں یہ تحریر پڑھنے میں آتی ہے۔

Phapamow Castle Allahabad.

پھاپامو کیسل الہ آباد۔ یہ یقینی طور پر ولیعہد کا رہائشی پتہ ہے، یہ وہ دور ہے جب لکھنؤ کے بجائے الہ آباد یوپی کا صوبائی دار الحکومت تھا، نیپال اور یوپی کی سرحد ملی ہوئی ہے، نیپال کے امراء مسوری اور نینی تال میں کوٹھیاں بنا کر یوں بھی رہتے تھے، ولیعہد نے اپنی جلا وطنی کے دن گذارنے کے لیے الہ آباد کو پسند کیا۔ مولانا فراہی بھی ابتداءً بسلسلۂ تعلیم بعدہٗ بسلسلۂ ملازمت الہ آباد میں رہے، ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۴ء تک سنٹرل میور کالج میں انھوں نے خدمت مدرسی انجام دی، اسی زمانے میں ولیعہد نے ان سے رسم و راہ پیدا کی ہوگی، خط میں کوئی تاریخ درج نہیں لیکن قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط مولانا کے الہ آباد میں قیام کے زمانہ کا ہے، اس لئے کہ خط بذریعہ ڈاک نہیں دستی بھیجا گیا اور لفافے پر صرف نام لکھنے کو کافی سمجھا گیا، جیسے یہ اس شہر بلکہ اسی محلے کا معاملہ ہو، خط کے بعض مندرجات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، مولوی اسحٰق صاحب خط میں جن کا حوالہ ہے خود الہ آباد میں مستقل آباد ہو گئے تھے، جارج ٹاؤن میں آج تک

ان کی عظیم الشان کوٹھی موجود ہے، ولیعہد نے مولانا کو لکھا کہ وہ خود خدمت میں حاضر ہو کر اپنا دیوان اصلاح کے لیے پیش کرے گا، خط کی تاریخ متعین کرنا ممکن نہیں لیکن اتنا طے ہے کہ یہ ۱۹۱۲ء سے پہلے کا ہے، خط لکھنے کی غرض و غایت خط کے مضمون سے واضح ہوتی ہے، ولیعہد نے مولانا کے لیے جو القاب و آداب استعمال کئے ہیں وہ نوٹ کرنے کے قابل ہیں، آخر میں ولیعہد خود کو مولانا کا تلمیذ لکھتا ہے، میرے لیے یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ میں ولیعہد کا ذکر مولانا فراہی کے تلامذہ میں کروں یا نہ کروں، میرے ریسرچ پروجیکٹ کا ایک باب تلامذۂ فراہی ہے اگر میں نے وسعت روا رکھی تو یوں یہ باب بہت طویل ہو جائے گا، کیفیت یہ ہے کہ ع

ز نخلِ خوش ثمر کیستی کہ باغ و چمن ہمہ ز خویش بریدند و در تو پیوستند

اس کے لیے مجھے کوئی معیار متعین اور دائرہ محدود کرنا پڑے گا، یہ بات بطور جملہ معترضہ درمیان میں آگئی، خط کے آخر میں خط نویسندہ کا نام اردو ہی میں یوں لکھا ہے، "یوبراج جنگ بہادر رانا تخلص شادی" اس کے بعد انگریزی خط شکست میں دستخط ہے، جس سے مترشح ہوتا ہے کہ شاید ولیعہد نے خط املا کرا کے دستخط کیا ہے،

میرا خیال تھا کہ اسلام آباد میں نیپالی سفارتخانے سے جنگ بہادر رانا کے مختصر حالات معلوم کر کے درج کروں لیکن اس کا موقع نہ ملا، نیپال کے ساتھ ہمارے دوستانہ تعلقات ہیں، نیپال کے موجودہ حکمراں کو اس بات سے یقیناً دلچسپی ہوگی کہ نیپال کے شاہی خاندان کا ایک پرانا خط اسلامیہ یونیورسٹی اسلام آباد کے ایک اسکالر کے پاس ہے، تمہید طویل ہوگئی، ان تعارفی کلمات کے بعد پہلے اصل خط بہ تمام و کمال ملاحظہ ہو، اس کے بعد مختصر جائزہ پیش کیا جائے گا۔

مجمع فضائل منبع فیوض ادام اللہ افضالکم

آداب و تسلیمات تلمیذانہ بجالا کر عرض پرداز ہوں کہ ایک غزل جو جناب والا نے بفرمایش میرے دوست محمد رضا صاحب ماسٹر کے ارسال فرمایا ہے، جس کو پڑھ کر آنکھوں سے لگایا اور مضامین نے حسب دلخواہ اس خاکسار کو ایک سبق سکھایا، جس کا کہ شکریہ میں تہ دل سے ادا کرتا ہوں، غرض یہ ہے جو خیالات میرے ہیں، وہ بہت تھوڑے ہیں، اور اس کو مختصر دیوان میں ظاہر کرنا چاہتا ہوں، مگر افسوس فارسی کیا بلکہ زبان اردو بھی مادری نہیں ہے مگر خوش قسمتی و عنایت و بخشش بزرگوں سے اسقدر فارسی حاصل ہوئی ہے، کہ اپنے خیالات کو بخوبی ظاہر کر سکتا ہوں، مگر بجز رہبری و دستگیری آنجناب والا القاب کے اس صوبہ میں مجھے کوئی شخص نظر نہیں آتا اگر ہیں بھی تو میری اُن تک رسائی محال ہے، مگر آنجناب سے بہت نزدیکی اس واسطے کہ میرے دوست قدیم محمد رضا صاحب آپکے بھائی مولوی محمد اسحٰق صاحب کے بہت قدیمی یار غار ہیں، اس واسطے وہی سلسلہ آپ کو میرے ساتھ رکھنا واجب معلوم ہوتا ہے، اور اب آپ کا چھٹنا مجھ سے امر محال ہے، میں خود خدمت میں حاضر ہو کر بوقت تیاری دیوان واسطے اصلاح کے پیش کرونگا، فی الحال دو غزلیں ارسال خدمت ہیں، امید کہ قبول ہو کر اصلاح فرمائی جائے، زیادہ حد ادب۔

تلمیذ

یوبراج جنگ بہادر رانا، تخلص شادی

دستخط انگریزی

غزل

شورِ آشوب قیامت فتنہ ساماں یکطرف　قہر بادنی گرگئی خلخالِ حسیناں یکطرف

زلفِ شبگوں رائج صد گونہ ظلماتِ کفر　روئے روشن دافعِ اندوہ حرماں یکطرف

تیر مژگاں الاماں صدتابۂ آہمن گذار　طرفہ ناوک افگنی چشمِ فتّاں یکطرف

انقلابِ فصلِ اردی آمدِ بادِ خزاں　آرزوی بلبلِ سیرِ گلستاں یکطرف

حلقۂ گیسو باطرافِ رخِ او فی المثل　خوبیِ صبحِ وطن شامِ غریباں یکطرف

بر رخِ کعبہ بزلفش حملۂ اصحابِ فیل　جورِ شبخوں کفرہم تائیدِ ایماں یکطرف

بادِ بسم اللہ مجریہا بہ کشتی ناخدا　موج ہر سو ساقیِ نوحِ غریباں یکطرف

خوش نوایانِ ریاضِ اصفہاں یکسو شدند
حق پیِ امداد شادیِ سخن داں یکطرف

(۲)

بشکلِ پارسا گاہے بہ سرشاری می آئی　بقربانت سوئے میخانہ مرزا وار می آئی

لقب امی واز صدر العلا مختار می آئی　دو عالم طرفہ او گوید کہ از سرکار می آئی

بانعامت نشہ مخمور دم تیس دکو کہن ساقی　گہے دربادیہ گاہے سوئے کہسار می آئی

قدم بر داشتی بے ساختہ ہمدوشِ دیوانہ　ولے در چشمِ من نامِ خدا ہشیار می آئی

مرنجان دل یکے مور ضعیف و ناتوانے را　کہ روزے در حضورِ حضرتِ جبار می آئی

کشیدی قشقہ بالائے جبیں از خاکِ بتخانہ　تعجب گو یدم در پیکرِ زنّار می آئی

ہمین دان جنت الماوی بود میخانہ ساقی　بگید واعظاں دروادیِ پُرخار می آئی

غلط کردی رہِ بتخانہ رفتی سوئے بیت اللہ　ز اقبالِ جنوں با قشقہ و زنّار می آئی

رسانیدی نوحِ کشتیاں را تا ساحلِ جودی　بجولِ فوتش دیدم کہ خود اسوار می آئی

خطا پوشی کن و ملبوس نوا یشار عریاں کن　　　که بخشد بیش ازاں چوں بر در ستاری آئی

بیا خوش آمدی شادی بگو از طرۂ گیسو

ختن را سیر کرده از ره تاتاری آئی

مولانا فراہیؒ کے نام ولیعہد نیپال کا اردو خط اور اصلاح کے لیے بھیجی گئی دونوں فارسی غزلیں آپ نے ملاحظہ فرمائیں، میرے لئے اس خط اور متعلقات کی اہمیت اس لیے ہے کہ ان کو مولانا فراہیؒ سے نسبت ہے اور مولانا فراہیؒ میرے تحقیقی منصوبے کا موضوع ہیں، اس سے سوانحی خاکے میں رنگ بھرنے میں مدد ملے گی، اس خط کی دریافت خود میری تحقیق کا ایک حاصل ہے، لیکن اس کے مطالعے سے تحقیق کی جو نئی راہیں سامنے آتی ہیں، وہ ذوقِ جستجو کو مہمیز کرتی ہیں، مولانا نے اس خط کا کیا جواب دیا، غزلوں میں کیا اصلاح دی، ولیعہد کا دیوان مرتب ہوا یا نہیں، اس دیوان کی ترتیب و تہذیب میں مولانا نے کیا مدد کی، دیوان اگر چھپا اور یقیناً چھپا ہوگا تو اس میں مولانا کا ذکر ضرور ہوگا، اور اس ذکر میں ایسی باتیں بھی ہوسکتی ہیں جو مجھے ابھی تک کسی اور ذریعے سے نہیں معلوم ہوئیں، لیکن میں ابھی ہندوستان سے متعلق مطالبات تحقیق کو ہی پورا نہیں کرسکا، نیپال تو نسبۃً اور بھی دور اور دشوار گذار ہے، اس کے مراجع تک رسائی خیال است و محال است و جنون۔

خط میں یوبراج کی اس خواہش کو کہ مولانا اصلاح دیں ابتداءً میں نے جسارت پر محمول کیا اور ازراہِ قدر خود شناسی، اسے چھوٹا منہ بڑی بات سمجھا، اس کی وجہ میرا یہ خیال تھا کہ ایک ہندو راجکمار بھلا کیا شعر کہے گا، اور وہ بھی فارسی میں اور مولانا بھلا کہاں یہ گوارا کریں گے کہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اس کی تک بندیوں کو اپنی اصلاح سے نوازیں، اس دردسری کے لیے ان کے پاس نہ وقت رہا ہوگا نہ دماغ،

لیکن جب میں نے خط شکستہ میں گھسیٹی ہوئی ان غزلوں کو ٹھیک ٹھیک پڑھ لیا تو مجھے یوبراج کی نسبت اپنے اس سوء ظن پر یک گونہ پشیمانی ہوئی، یوبراج کا کلام اتنا بلند نہیں تو اتنا پست بھی نہیں بلکہ اس کے بعض پہلوؤں نے تو مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا، اور میں یہ بدگمانی کرنے لگا کہ خود کہنے کے بجائے کسی مسلمان شاعر سے کہلوایا نہ ہو، اشعار میں بعض معمولی قسم کی فنی خامیاں بھی ہیں، مگر بحیثیت مجموعی میری نظر میں حرف گیری کی گنجائش بہت کم ہے، ان غزلوں میں مسلم ثقافت کا جو رنگ جھلکتا ہے، افکار کے علاوہ پیرایۂ اظہار میں دینی الفاظ و محاورات، تشبیہات و استعارات اور تلمیحات کا جو استعمال ہوا ہے وہ نتیجہ ہے کچھ تو فارسی زبان سے تعلق کا اور کچھ مسلمان اہل علم کی صحبت اور شاگردی کا جس میں ایک نمایاں نام خود مولانا فراہیؒ کا ہے، فارسی کا مقولہ ہے۔

صحبتِ صالح ترا صالح کند　　　صحبت طالح ترا طالح کند

جس طرح انسان کی صحبت کا اثر ہوتا ہے، اسی طرح کتابوں میں لکھی ہوئی زبان بھی اپنا مخصوص اثر ڈالتی ہے، نیپال کے شاہی خاندان میں مذہباً ہندو ہونے کے باوجود فارسی سے یہ شغف کہ خود ولیعہد وقت تمام تر دشواریوں کے باوجود اتنی صلاحیت بہم پہنچالے کہ شعر و شاعری کا شغل اختیار کرے لائق توجہ بھی ہے اور قابل قدر بھی۔ فارسی اور فارسی گویوں سے تعلق پیدا کرکے ہی وہ اس قسم کے اشعار کہہ سکتا تھا، جس کا نمونہ اس کی مذکورۂ بالا دو غزلوں میں موجود ہے، ذرا ان الفاظ اور فقروں کا اشعار میں برتنا تصور میں لائیے،

شورِ آشوب قیامت، قم باذنی، ظلمات کفر، رخ کعبہ، حملۂ اصحابِ فیل، نائید ایماں، بسم اللہ مجریہا، نوح، ریاض، حق، حضور، حضرت جبار، تمق، زوار،

جنت الماوی، سوے بیت اللہ، نوح کشتیاں، ساحل جودی، بجول قوتش اور یہ شعر بھی

لقب امی واز صدر العلا مختار می آئی	دو عالم طرقوا گویید کہ از سرکار می آئی
خطا پوشی کن و طبوس نوا ایثار عریاں کن	کہ بخشندہ بیش از یں چوں بدر ستار می آئی

ذخیرۂ الفاظ کے علاوہ یہ خیالات بھی ولیعہد نے فارسی اردو کی ایسی کتابوں اور ایسے اہل علم سے سیکھے جو دین اسلام کے نقیب تھے،

یہ تو معلوم نہیں کہ مولانا نے یوبراج جنگ بہادر کے خط کا واقعۃً جواب کیا دیا، ممکن ہے حوصلہ افزائی کے خیال سے انھوں نے کوئی ایسی بات نہ لکھی ہو اور غزلوں پر حتی الوسع اصلاح دینے کی بھی کوشش فرمائی ہو لیکن ہماری حیرت کے لیے انھوں نے ایک غزل کے نیچے جان محمد قدسی کی ایک رباعی لکھ کر یوبراج کی شاعری کے متعلق فی الجملہ اپنی رائے کا قلم برداشتہ اظہار کر دیا ہے، آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:-

نہ ہر کہ چہرہ بر افروخت دلبری داند	نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند
ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجا است	نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

یہ رباعی مولانا نے اس غزل کے نیچے لکھی ہے، جس کی ردیف "می آئی" اور قافیہ سرشار، سرکار، غفار، وغیرہ ہے۔

شادی صاحب کی غزل اور مولانا کی ناقدانہ رائے پڑھ کر پہلا تاثر یہی پیدا ہوتا ہے کہ یہ تنقید سخت ہے، مولانا نے تو سرے سے اسے درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا، لیکن غور و تامل کے بعد نظر آتا ہے کہ میری تعریف تحسین ناشناس کے زمرے میں آتی ہے، اور مولانا کا تبصرہ ایک سخن شناس استاد اور ماہر فن کا فی البدیہہ اظہار خیال ہے،

مولانا کے مزاج میں تکلف نہیں تھا، اس لئے اغلباً انھوں نے اس قسم کی رائے

ولیعہد بہادر کو لکھ بھی دی ہوگی، اور بہ نظر تعمق دیکھا جائے تو بات معیار اور مقام کی ہے، فارسی زبان اور فارسی شعر و سخن میں میری نظر ایک نیم خواندہ بلکہ ناخواندہ کی نظر ہے، جس نے تحت الثریٰ میں بیٹھ کر گرد و پیش کا جائزہ لیا ہے، جب کہ مولانا کا مقام زباندانی اور شاعری کی کائنات میں اوج ثریا نہیں بلکہ سدرۃ المنتہیٰ ہے، جو لوگ مولانا کے حالات سے باخبر نہیں ہیں وہ میری اس بات کو مبالغہ آرائی پر محمول کریں گے، لیکن میں علی علم و بصیرۃ اپنی بات پر اصرار کروں گا، یہاں اس کے اسباب کی بحث چھیڑ دی گئی تو یہ مضمون اپنی حد سے بہت آگے نکل جائے گا، یہ بحث مولانا فراہی پر میرے مقالے میں اپنے مقام پر آئے گی جہاں ان کی فارسی دانی اور فارسی شاعری سے بحث ہوگی،

اب تک میں نے تلامذۂ فراہی کے باب کے لیے جو مواد جمع کیا ہے وہ اچھا خاصا ہے، لیکن اس میں سب علما و فضلا ہی ہیں جنھوں نے عربی اور علوم دین میں ان سے فیض پایا، یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ شعر و شاعری میں بھی ان کا کوئی شاگرد ہوگا، شادی صاحب نے خود کو مولانا کا شاگرد لکھا ہے اور اصلاح کی درخواست کی ہے، اس انکشاف کے بعد کہ مولانا نے انہی شادی صاحب کی فرمائش پر غزل لکھی یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہیں معلوم ہوتا کہ مولانا نے انھیں اپنی شاگردی میں لے بھی لیا، عزت و احترام کے ساتھ، ایک شاگرد کے لیے یہ بڑا اعزاز ہے کہ استاد نے اس کی فرمائش پر غزل لکھ دی اور اس کا تخلص بھی نظم کر دیا۔

بعض غور طلب مکتوبات

۹ فرنگی محل لکھنؤ یکم فروری ۸۳ء

محترم سید صاحب!

السلام علیکم

جنوری کا معارف ملتے ہی آپ کے شذرات پڑھے، سوال جس کو آپ نے غور طلب پایا ہے، میری ناقص رائے میں وہ ایسا بدیہی ہے کہ اگر مسلمان اس پر غور نہیں کرتے تو وہ حق بجانب ہیں، میں مسلم سیاست سے کم و بیش پچاس برس سے قریب رہا ہوں، آزادی کے بعد مسلم سیاست کے بارے میں اب اس نتیجہ پر پہونچ گیا ہوں کہ اب اس میں پارٹی سیاست گھس گئی ہے، جو مدعیٔ قیادت جس پارٹی سے وابستہ ہے، یا اس کا دست گرفتہ ہے، وہ مسلمانوں کو اس میں جھونک دینا فرض سمجھتا ہے، حالانکہ مسلم سیاست کے یہ معنیٰ نہیں ہیں، مولانا محمد علی اور ان کے مرشد مولانا عبدالباری کی کیسی صاف مثالیں موجود ہیں، کہ مسلم سیاست کے تقاضے سے ایک نیا عنصر بھی داخل ہو گیا، وہ ہے بیرون ہند کی مختلف ملکوں سے مربیانہ قیادت کی وفاداریاں اور ان وفاداریوں کے سلسلہ کی فکر، اگر

بیرون ہند کے مسلم مفادات کو بے لوث ہو کر مسلم سیاست میں پیش نظر رکھا جائے تو عین سیاست ملی ہے، یہ انداز فکر ترکی خلافت کے سلسلہ میں ہندوستانی مسلمانوں نے ثابت کر دکھایا یا سعودی تحریک کے زمانہ میں شدید اختلاف کے باوجود دونوں متحارب گروہ امید دار صلہ و انعام نہیں تھے، میری اس ناقص رائے پر اگر اور لوگ تبصرہ فرمائیں تو بڑی خوشی ہوگی، چونکہ اس وقت آلودۂ سیاست نہیں، شاہد سیاست ہوں، اس لیے بہت کچھ نیا راستہ دکھائی پڑ رہا ہے۔

والسلام

محمد رضا انصاری

مراد آباد ۷ر فروری ۸۳ء

جناب سید صاحب!

السلام علیکم

جنوری کے معارف میں ملی قیادت کے سلسلہ میں آپ کے شذرات بہت ہی دردناک ہیں، مسلمانوں کے زوال کی جڑ یہی ہے، خلافت راشدہ کے بعد ہی سے قیادت کی راہیں بدل گئیں، پھر ملت کو یہ شرف نصیب نہیں ہو سکا، کاش اس پر ملت کے دردمند غم خواہ توجہ فرمائیں، اس موضوع پر دوسروں کو بھی لکھنے کی دعوت دیجئے۔ دردِ فکر خدا نصیب فرمائے، یہ ضرورت نہ صرف عالم اسلام کے لیے، بلکہ پورے عالم کے لیے ہے، اور یہ دنیا اٹیم سے قیامت کی طرف جا رہی ہے۔ والسلام

افتخار فریدی

مطبوعات جدیدہ

خطبات بہاولپور:- از ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کاغذ عمدہ، طباعت ٹائپ، صفحات ۴۳۲، قیمت ۵۰ روپے، ناشر رجسٹرار اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور۔

اسلامی علوم کے ماہر اور نامور فاضل ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کی دعوت پر "بارہ" خطبے دیے تھے، زیر نظر کتاب ان ہی کا مجموعہ اور یونیورسٹی کے مجلہ مفکر کا خاص نمبر ہے، شروع کے چار خطبوں میں اسلام کے بنیادی مآخذ یعنی قرآن و حدیث اور فقہ و اجتہاد کی تاریخ بیان کی گئی ہے، پہلے خطبہ میں قرآن مجید کی جمع و تدوین کے سلسلہ میں گذشتہ آسمانی کتابوں کا ذکر بھی آگیا ہے، اس میں بتایا ہے کہ سابقہ صحف و کتب میں بعض تو سرے سے موجود ہی نہیں ہیں، اور جدید تحقیقات سے جن کتابوں کے کچھ اوراق و مندرجات دریافت ہوئے ہیں ان کے صحیفۂ ربانی ہونے کا کوئی یقینی ثبوت نہیں، اس بحث کے آخر میں عہد نامۂ قدیم و جدید کا تذکرہ ہے، اس میں توریت کی متعدد بار گمشدگی کا ذکر کیا ہے، جو اس کا ثبوت ہے کہ وہ بعینہٖ کلام الٰہی نہیں ہے، اسی طرح مروجہ چاروں انجیلوں کے بارہ میں بتایا ہے کہ وہ دراصل حضرت عیسیٰؑ کی سوانحعمری ہیں، اس لئے استناد کے لحاظ سے یہ سب مسلمانوں کی کتب سیرت کے ہم پایہ ہیں، پھر قرآن مجید جس محفوظ صورت میں مسلمانوں تک پہنچا ہے اس کی تفصیل پیش کی ہے، ڈاکٹر صاحب نے آنحضرتؐ کی مکی زندگی کے ایسے واقعات تحریر کیے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شروع ہی سے قرآن مجید کی نقل و کتابت اور جمع و تدوین کا کام انجام پاتا رہا ہے، نیز آپ نے اپنی وفات کے وقت اسے مرتب و مدون حالت میں چھوڑا تھا

اس کے بعد عہد صدیقی و عہد عثمانی کی جمع و ترتیب کی صحیح نوعیت بتائی ہے، دوسرے خطبہ میں حدیث کی دینی اہمیت واضح کرنے کے بعد عہد نبویؐ کے تحریری سرمایہ کا مفصل جائزہ لیکر دکھایا ہے کہ اس عہد میں تحریر و کتابت کا رواج بھی تھا، اور احادیث کے علاوہ آپؐ کے مراسلے وغیرہ بھی قلمبند کیے گئے تھے، پھر صحابۂ کرام اور ان کے بعد کے زمانہ میں آپؐ کے اقوال و افعال جس مستند طریقہ پر مرتب کیے گئے اس کے بارہ میں لکھا ہے کہ اسکی مثال دوسری قوموں کے انبیاءؑ کے حالات تو درکنار ان کی مذہبی و آسمانی کتابوں کی ترتیب میں بھی نہیں ملتی، تیسرے خطبہ میں فقہ اسلامی کی تاریخ بیان ہوئی ہے، اس ضمن میں اس کی تشکیل، نشوونما، امام ابو حنیفہؒ کے زمانہ میں اس کی باقاعدہ تدوین اور اس کے اہم مآخذ و مصادر پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، اور اس زمانہ کے رائج رومن لا پر اس کی برتری بھی دکھائی ہے، چوتھا خطبہ اصول فقہ و اجتہاد کی تاریخ پر مشتمل ہے، اس میں اس کی وضاحت کی ہے کہ اسلامی قانون کی تدوین کسطرح عمل میں آئی اور نئے مسائل کو قرآن و سنت کی روشنی میں کس طرح حل کیا جاتا تھا، نیز دور حاضر کے اجتہادی مسائل میں اجتماع کی صورت کیا ہے، پانچواں خطبہ بڑا اہم ہے، یہ قانون بین الممالک پر ہے، اس میں دو مملکتوں کے باہمی تعلقات کے اصول و قوانین پر روشنی ڈالی ہے، اور بتایا ہے کہ مسلمانوں کے یہاں اسکا آغاز کسطرح ہوا، سیر کی اصطلاح اور اس موضوع پر مسلمان علماء و فقہا کی مختلف تصنیفات اور انکے مندرجات پر بحث کرکے انٹرنیشنل لا کے سلسلہ میں انکی اہمیت واضح کرتے ہیں، ڈاکٹر صاحب پورے وثوق سے فرماتے ہیں کہ اس علم کو وجود بخشنے والے مسلمان ہیں، وہ قدیم یونانی اور رومی اور موجودہ یورپی دور میں انٹرنیشنل لا کے رواج کی پر زور تردید کرتے ہیں، چھٹا خطبہ دین پر ہے، اس میں حدیث جبرئیلؑ کی روشنی میں عقائد و ایمانیات، اسلامی عبادات اور احسان و تصوف کی حقیقت و اہمیت بہت دلنشین انداز میں واضح کی ہے، آخر کے چھ خطبوں میں سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر عالمانہ بحث و گفتگو کی ہے، اس سلسلہ کے پہلے خطبہ میں آنحضرت صلعم کی مملکت کے نظم و نسق کا

ذکر ہے، اس میں آپ سے قبل عرب کے عام نظم و نسق، دفاع، مالیہ، عدلیہ اور تعلیم و تربیت وغیرہ مختلف شعبوں کا ذکر ہے، اسکے بعد دفاع و غزوات پر ایک مستقل خطبہ ہے، نویں خطبہ میں دورِ نبوت کے نظام تعلیم اور آپ کے علوم کی سرپرستی فرمانے کا ذکر ہے، ایک خطبہ میں عہد نبوی کے تشریعی نظام اور عدلیہ پر مفید گفتگو کی گئی ہے، ایک اور خطبہ میں مالی نظام اور تقویم پر بحث کی گئی ہے آخری خطبے میں رسول اللہ صلعم کی تبلیغِ اسلام کے طریقے اور غیر مسلموں کے ساتھ آپ کی رواداری اور شریفانہ برتاؤ کی تفصیل پیش کی ہے، خطبوں کے بعد ڈاکٹر صاحب سے سوالات کئے جاتے تھے اور وہ انکے جواب دیتے تھے، ہر خطبہ کے آخر میں یہ سوال و جواب بھی درج ہیں جو دلچسپ اور معلومات سے پُر ہیں، اسلامی علوم کی تاریخ، قانون بین الممالک اور عہد نبوی کا نظامِ دفاع و تعلیم وغیرہ پر ڈاکٹر صاحب کی مستقل کتابیں پہلے چھپ چکی ہیں اور وہ ان موضوعات پر برابر غور و فکر اور تحقیق فرماتے رہے ہیں، اسلئے یہ خطبے انکے برسوں کے مطالعہ کا نچوڑ ہیں، ڈاکٹر صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے وسیع مطالعہ کی بنا پر مسلمانوں کے مختلف فقہی و اعتقادی گروہوں کے بارہ میں بڑے معتدل واقع ہوئے ہیں اور مختلف فیہ مسائل میں اپنی رائے مسلط کرنے کے بجائے ہر شخص کو اسکے مسلک پر عمل کرنے کی تلقین فرماتے ہیں، بعض مسائل میں نقطۂ نظر دوسروں سے مختلف ہے، مثلاً موسیقی کا جواز، ٹیلیویژن دیکھنے کی حرمت، ناموس سے تورات مراد لینا، رجم کو قرآن سے اسطرح ثابت کرنا کہ تورات میں زنا کی یہی سزا تھی جسکو رسول اللہ صلعم نے اسلئے برقرار رکھا کہ آپ کو قرآن نے یہ ہدایت کی تھی کہ جن چیزوں کے بارہ میں آپ کو کوئی وحی نہیں کیگئی ہے ان میں اہل کتاب کے حکم پر عمل کریں وغیرہ، ڈاکٹر صاحب نے قرآن کے بیان کردہ مصارفِ زکوٰۃ کی تفصیل و تعیین میں قدیم فقہاء کی رائے پر اکتفا نہ کر کے انکی بہت سی مزید صورتیں بھی بتائی ہیں، اور غیر مسلموں اور مجبوری کی حالت میں سادات کو بھی زکوٰۃ دئے جانے کا جواز ثابت کیا ہے، انکے نزدیک فی سبیل اللہ میں فوجی ضرورتوں کے علاوہ مسجدوں، سراؤں، اور مدرسوں کی تعمیر اور مردوں کی تجہیز و تکفین بھی کی جاسکتی ہے، ابن السبیل میں مسلم و غیر مسلم، سڑکوں اور پلوں کی تعمیر، سڑکوں کیلئے محافظ پولس کا انتظام وغیرہ بھی شامل ہے، وہ مردہ کی آنکھ زندہ کو اور مریض کیلئے تندرست کے خون دینے کو جائز سمجھتے ہیں، بینک یا کسی اور سود کو اس صورت میں جائز قرار دیتے ہیں جب قرض دینے اور لینے والے منفعت اور خسارے میں برابر کے تناسب سے شریک رہنے پر آمادہ ہوں، حکومتیں اور مجبور اشخاص بوقت ضرورت سود پر قرض لے سکتے ہیں لیکن اس صورت میں بھی سود خوار کو اللہ معاف نہ کریگا وغیرہ، ان مسائل میں اختلاف رائے کی گنجائش ہو سکتی ہے مگر انکے حل اور غور و فکر کی راہ بھی ہموار ہوتی ہے، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور نے [illegible] ان خطبوں کو اہتمام سے شائع کیا ہے جو تحسین کی مستحق ہے، طباعت کے اغلاط ڈاکٹر صاحب نے علحدہ کاغذ پر تحریر کر کے کتاب کے ساتھ منسلک کر دئے ہیں۔

"ض"

جلد ۱۳۱ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۸۳ء عدد ۳

مضامین

مقالات

وفیات